شبلی صدی تقریبات
شبلی کی آپ بیتی
تحقیق و ترتیب: ڈاکٹر خالد ندیم

مولانا شبلی نعمانی کی شخصیت اور کارناموں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، جس میں مدح وقدح ہے اور تعریف وتوصیف کے ساتھ ان پر کیچڑ بھی اچھالی گئی ہے، مگر وہ خود اپنے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اور اپنی کاوشوں اور کارگزاریوں کو کس نظر سے دیکھتے تھے؟ اِس کا بہتر اور صحیح اندازہ ان کی اپنی تحریروں سے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر خالد ندیم نے شبلی کی جملہ تحریروں، زیادہ تر ان کے مکاتیب سے، ان کی آپ بیتی مرتب کی ہے؛ جو شبلی کی صحیح، سچی اور کھری تصویر ہے۔ اس تصویر میں، شبلی جیسے تھے، ویسے ہی نظر آتے ہیں۔ ان کے احساسات، جذبات، ولولے، عزائم، ارادے اور منصوبے ماہ وسال کی گزرتی ساعتوں کے ساتھ بدلتے بھی رہے، لیکن ان کی نظر منزلِ مقصود پر جمی رہی۔ یہ منزل تھی احیائے ملت اور احیائے دِین۔

شبلی نے اپنی خودنوشت نہیں لکھی، لکھ نہیں سکے۔ اب تک کہ ان کی وفات پر سو سال گزر گئے، کوئی اَور بھی نہیں لکھ سکا۔ یہ مقدر خالد ندیم کا تھا، چنانچہ یہ سعادت انھیں ملی، ’جز قیس اور کوئی نہ آیا بروے کار‘۔ انھوں نے مطالعاتِ شبلی کے ضمن میں ایک بڑی کمی پوری کردی۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ راقم کے خیال میں ایسی خودنوشت تیار کرنا باقاعدہ سوانح عمری تحریر کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ سوانح نگار تجزیہ وتبصرہ کی مدد سے سوانح عمری کے خلا پُر کر دیتا ہے، مگر زیرِ نظر خودنوشت میں ایسا ممکن نہ تھا، تاہم مرتب نے قلابین میں اضافی معلومات شامل کر کے بعض ابہامات کو کلیتاً دُور کیا اور بعض ابہامات کی ممکنہ حد تک وضاحت کردی ہے۔

خالد ندیم نے پاکستان ہی نہیں، بھارت، بلکہ کُل عالم کے شبلی شناسوں کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔ شبلی صدی کے موقع پر شبلی پر کئی کتابیں چھپی ہیں، آئندہ اس سے بھی زیادہ شائع ہوں گی۔ بایں ہمہ پورے شبلی کو سمجھنے کے لیے زیرِ نظر کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہوگا۔

رفیع الدین ہاشمی

۲۹ر اکتوبر ۲۰۱۴ء

الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔ پاکستان
فون: 0092-42-37239884-37320318
ای میل: kitabsaray@hotmail.com

اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 32212991-32629724

شبلی کی آپ بیتی

تحقیق و ترتیب:

ڈاکٹر خالد ندیم

نشریات

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔فون: 0321-4589419

نام کتاب: شبلی کی آپ بیتی
تحقیق وترتیب: ڈاکٹر خالد ندیم
اہتمام: نشریات لاہور
مطبع: شفیق پریس
صفحات: ۳۷۶

ڈسٹری بیوٹرز

اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 32212991-32629724

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 37320318 فیکس: 37239884
ای میل: Kitabsaray@hotmail.com

ترتیب

شبلی کی آپ بیتی:

انتساب

والد گرامی

حاجی عنایت علی

(۲۸ر مئی ۱۹۲۹ء امرتسر - ۲۳ر فروری ۲۰۱۳ء شیخوپورہ)

کی یاد میں

اے چارہ گرو! ہے کوئی پیوند کی صورت
ٹوٹا ہے وہ آئینہ کہ جو قبلہ نما تھا

تقدیم

ہم اپنی ایک اہم اسلامی ادبی روایت سے کٹ گئے ہیں؛ وہ ادبی روایت، جس کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہوا تھا۔ اس ادبی روایت کے بانیوں کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اسلامی علوم اور تاریخ وادب کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ عربی فارسی زبان اور ادبیات کا غایت درجہ ذوق رکھتے تھے۔ وہ ان زبانوں کے معروف ادبی شہ پاروں اور شاعری سے نہ صرف آشنا تھے، بلکہ ان زبانوں میں اشعار کہنے کی قدرت بھی رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اردو زبان میں تاریخ وثقافت، ادب، شاعری اور معاشرتی پہلوؤں پر علمی مضامین اور کتابیں لکھ کر اُردو زبان کے دامن کو بھی ثروت مند بنا دیا تھا۔ وہ مغربی ادب کے جدید رجحانات اور جدید سائنسی علوم میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ اسلامی فکر کے داعی تھے۔ یہ اصحابِ علم ونظر ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی بہبود وترقی اور اُن کے اسلامی تشخص کی حفاظت اُن کی ادبی تخلیقات کا اوّلین مقصد تھا۔ اس ادبی طائفہ میں سرسید احمد خان سرِ فہرست تھے اور الطاف حسین حالی، نواب محسن الملک، مہدی حسن، سید علی بلگرامی انھی کو اپنا رہبر سمجھتے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی نے کہا تھا، 'ہم لوگ بمنزلہ سرسید کے سیاروں کے ہیں اور اُن کی تیز روشنی میں ہماری روشنی ماند رہتی ہے۔ اگر ہم علی گڑھ سے باہر نکلیں اور سورج کی روشنی سے دُور ہوں تو ہم بھی مثل اُن ستاروں کے چمک سکتے ہیں، جو سورج سے فاصلے پر ہیں'۔

مولانا شبلی نعمانی سیاسی اور مذہبی خیالات میں سرسید احمد خان سے اختلاف رکھنے کے باوجود اُن کی تعلیمی تحریک سے نہ صرف متاثر تھے، بلکہ علی گڑھ کالج میں تدریس کے فرائض

بھی سرانجام دیتے رہے، لیکن سیرت نگاری اور مسلم مشاہیر کی سوانح عمریاں لکھنے میں جو مقام شبلی نے کمایا ہے، وہ کسی اَور کے حصے میں نہیں آیا۔ اُنھوں نے اسلامی تہذیب و تاریخ کو جدید فکری رجحانات کے مطابق نئے ادبی اسلوب میں ڈھال کر پیش کرنے میں پیش قدمی کی اور ایک ایسی راہ متعین کر دی، جس کی پیروی کرنے سے، آنے والے مؤرخین، سیرت نگار اور ادیب بے نیاز نہ ہو سکے۔

مولانا شبلی نعمانی کی حیات اور کارناموں پر کئی اصحابِ علم و فن نے قلم اُٹھایا ہے۔ اُن کے شاگردِ رشید، سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی لکھ کر پہلی بار مولانا کی شخصیت اور اُن کے کارناموں سے اہلِ علم کو جامعیت کے ساتھ آگاہ کیا۔ کچھ اصحاب نے مولانا کی شخصیت کے نادر گوشوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی، تا کہ اُن کی تصنیفات کا تفرد قائم ہو جائے، لیکن یہ سب کو معلوم ہے کہ شبلی نعمانی کی شخصیت ہماری اسلامی ادبی دنیا کا ایک درخشاں باب ہے۔ اُن کی شخصیت جامع کمالات تھی۔ وہ ایک بلند پایہ انشا پرداز، جیّد مؤرخ، فارسی اور اُردو کے شاعر اور روایتی اور جدید اسلامی افکار کے نقیب تھے۔ شبلی ایک ادارے، ایک انجمن اور ایک منفرد مکتبِ فکر کا نام ہے۔

جناب خالد ندیم کی کتاب شبلی کی آپ بیتی ایک منفرد اور اچھوتی کاوِش ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اس میں مولانا شبلی نے اپنی زندگی کی کہانی خود بیان کی ہے۔ یہ کتاب صیغہ متکلّم میں لکھی گئی ہے۔ تمام مواد اور الفاظ شبلی نعمانی کے ہیں، جنھیں تاریخی ترتیب اور منطقی ربط کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ واقعی شبلی کی آپ بیتی ہے۔ اس کا آغاز ذوقِ شبلی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اُن کے فارسی کے اشعار سے کیا گیا ہے، جن میں اُن کی ولادت کے شہر بندول کی توصیف کی گئی ہے اور نثر میں اختتام اس طرح ہوتا ہے۔ '[۱۵ر نومبر ۱۹۱۴ء کی شام ہاتھوں سے اشارہ کر کے] اب کیا رہا...... زبان سے ...... اب کیا...... اب کیا...... سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے...... (سیّد سلیمان): سب کام

چھوڑ کر سیرت تیار کردؤ۔

ڈاکٹر خالد ندیم کا نام ہمارے نقادوں اور محققین میں ایک جانا پہچانا اور معتبر نام ہے۔ تحقیق اور تنقید دونوں میں اُن کا کام ان کی دقتِ نظر اور تخلیقی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ جدید تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے کلاسیکی شاہکاروں پر بھی اُن کی گہری نظر ہے۔ شبلی پر ان کا زیرِ نظر کام صرف شبلی کی آپ بیتی ہی نہیں، بلکہ ہماری عہد ساز ادبی اور تہذیبی تاریخ کی ایک بصیرت آموز دستاویز بھی ہے۔

جناب خالد ندیم جانتے ہیں کہ علم و ادب شبلی نعمانی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ بقول شبلی 'مَیں اس طرح خلق ہوا ہوں کہ حصولِ علم کا جذبہ میرے خون میں سرایت کیے ہوئے ہے'۔ کتاب پڑھنے سے علامہ شبلی کی یہ خصوصیت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ خالد ندیم صاحب نے اس نگارش کے ذریعے شبلی کے حقیقی زندگی کے واقعات کو خود اُن کی زبان سے اس طرح پیش کیا ہے کہ یہی گمان ہوتا ہے کہ یہ شبلی کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ مؤلف کی اس ماہرانہ کاوش پر مَیں اُن کو ہدیہ تبرک پیش کرتا ہوں۔ اُنھوں نے یہ کام کر کے نئی نسل کو ایک وقیع ادبی روایت سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ میری دلی تمنّا ہے کہ کوئی بندہ خدا ہمت کر کے شبلی کے معاصر علما اور ادیبوں کے رشحاتِ قلم میں سے تحریروں کا انتخاب کر کے ایک کتابی شکل میں اکٹھا کر کے شائع کر دے تو اس طرح اُردو ادب کا ایک بیش بہا اثاثہ نئی نسل تک منتقل ہو جائے گا۔

ممتاز احمد

ایگزیکٹیو ڈائریکٹر

اقبال انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ فار ریسرچ اینڈ ڈائیلاگ

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

تبریک

ندیمِ دوست سے بوے دوست کا مشامِ جان بن کر آنا ایک تکوینی طریقہ کار ہے۔ سلسلۂ سعادت کی ایک بہت نمایاں مثال نظر کے سامنے ہے، جس پر رشک آتا ہے۔ ڈاکٹر خالد ندیم کے مسندِ ارشاد کا نسب نامہ اقبالیات کے سنگِ نشاں، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی سے براہِ راست ناز و نیاز کا حامل ہے اور ہاشمی صاحب کو اپنے استاد پروفیسر وحید قریشی مرحوم سے والہانہ عقیدت تھی۔ راقم نے بارہا یہ منظر دیکھا ہے۔ صحائف میں ثبت اس قول کا مشاہدہ میرے صدق و یقین کے لیے کافی ہے کہ انسان کو وہی ملتا ہے، جو وہ انجام دیتا ہے۔ پروفیسر وحید قریشی سے بارہا نیاز حاصل ہوا، ہاشمی صاحب ہی ہم راہ و ہم راز رہے۔ گھنٹوں کی گفتگو میں استاد کے فیضانِ نظر کے رُو برو شاگرد کی محویت کا عالم میرے لیے مثالی ہوتا۔ سرگودھا اور لاہور میں شیخ و شاگرد کے مراسم کا دوسرا مشاہدہ ڈاکٹر خالد ندیم سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اپنے شاگردوں کی ترکیب و تربیت میں روے نکوے معالجہ کے نسخہ خاص کا استعمال کیا ہے۔ سیرت و شخصیت کی رفعتوں کے ساتھ علمی قد و قامت میں امتیاز رکھنے والے شاگردوں میں ڈاکٹر خالد ندیم کو آفریں باد کہتا ہوں کہ انھوں نے بیشہ تحقیق کی برومندی کو بحال ہی نہیں کیا، بلکہ آگے بھی بڑھایا ہے۔ اقبال دشمنی کو ہدف بنانے کے لیے دشنہ و دُشنام فراہم کرنے والے اختر حسین راے پوری کی خدمات پر آپ نے وقیع کتاب پیش کی، جو اِن کی کاوشِ تحقیق کی قابلِ قدر مثال ہے۔ اپنے استاد پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کی خدمات کا ایک بیش قیمت ارمغان بھی مرتب کیا۔

ان کے متعدد مقالے میری نظر میں ہیں۔ان کی تنقیدی آ گہی کے ساتھ تحقیق کا بھرپور ارتباط ان مقالوں کی معنویت کا خاص امتیاز ہے۔وہ ہر مضمون یا تحریر کو تحقیق کے بھرپور اصولوں سے مزین کرتے ہیں اور کوئی نکتہ بدونِ حوالہ قلم بند نہیں کرتے۔تنقید میں نفسِ مضمون کی رُوح تک رسائی میں ان کو بڑا اِدراک حاصل ہے۔محسوس ہوتا ہے:

ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں نشو و نما کا

تنقید کی بے بصیری اور تحقیق کی کم سوادی سے ہمارا انتقادی ادب علمِ نخیل بے رطب ہوکر رہ گیا ہے۔دونوں کا ثمر بیز ہونا تخلیق کی سیرابی کی دلیل ہوتی ہے۔ڈاکٹر خالد ندیم نے دونوں کے حسنِ امتزاج کو قائم رکھ کر اپنی نگارشات کو مرکزِ التفات کی صورت دی ہے۔یہ بھی حیرت خیز بات ہے کہ اب ان کی توجہ علامہ شبلی کے لازوال کارناموں کی طرف ہے۔تخلیق اور تفکر کے اعتبار سے علامہ شبلی اور اقبال کا متبادل اردو کیا، دوسری ادبیات میں بھی مشکل سے ملے گا۔ان کی تخلیقی عظمتوں کے طفیل ہمیں شرف حاصل ہوا ہے۔بین الاقوامی زبانوں میں ان کے تراجم نے اردو کو آفاقی شناسائی سے سرفراز کیا ہے۔ان پر قلم اُٹھانا 'کارِ ہر دیوانہ نیست' کے مثل ہے۔انھوں نے علامہ شبلی کے فارسی خطوط کا ترجمہ کیا ہے، مکتوب نگار پر ایک طویل مقالہ قلم بند کیا اور اب شبلی کی آپ بیتی پر نظر ہے۔ان کے صریرِ خامہ کو بوسہ دینے کو جی چاہتا ہے۔علامہ کی تمام تحریروں کے سوز و ساز کو سامنے رکھ کر آپ بیتی کی تسوید پر خاکسار تبریک و تہنیت پیش کرتا ہے۔

سید سلیمان ندوی خلوتیانِ راز تھے اور جلوتوں کے ظہور میں بھی مشاہدِ اوّل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حیاتِ شبلی ان کے فرازِ قلم کی ادنیٰ مثال ہے۔سو سال بعد شبلی پر قلم اُٹھانا جہاں بینی سے کم نہیں۔ڈاکٹر خالد ندیم نے فہم و فراست کے ساتھ ذمہ داری قبول کی ہے۔یوں بھی وہ سرسری گزرنے کے قائل نہیں ہیں۔آپ بیتی کے کوائف جمع کرنے میں خونِ دل کی کشید کرنی پڑی ہے۔عبارتوں کے بین السطور حقائقِ زندگی کو بے حجاب دیکھنے اور بصیرتوں

کو بروے کار لانے میں وہ کامیاب ہیں۔ یہ قلم سے کسبِ ضیا کی ایک انوکھی مثال بھی ہے۔

خود علامہ نے اپنے قارئین سے درونِ دل میں داخل ہونے کا مطالبہ کیا ہے:

صد حرفِ راز بود نہاں در نگاہِ من

شبلی شناسی کی صدی میں ڈاکٹر خالد ندیم کی یہ کاوِش، نشاطِ کار کی قابلِ قدر مثال ہے۔

قلم کے شذرات سے قباے زندگی کی ترتیب و تطہیر جوے شیر لانے سے کم نہیں:

انھیں کا کام ہے یہ، جن کے حوصلے ہیں زیاد

پروفیسر عبدالحق
دہلی یونی ورسٹی، دہلی

پیش گفتار

علامہ شبلی نعمانی محض ایک عالم، ایک معلم، ایک مؤرخ، ایک سوانح نگار، ایک نقاد یا ایک شاعر ہی نہ تھے؛ بلکہ وہ مسلمانانِ ہند کے اوّلین رہنما تھے، جس نے ان کی دینی، تعلیمی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی ضرورتوں کو سمجھا اور پھر ان کے حصول کے لیے ہمہ جہت جدوجہد بھی کی۔ انھوں نے کبھی مصلحت سے کام نہ لیا، بلکہ جس امر کو ہندی مسلمانوں کے مستقبل کے لیے ناگزیر جانا، اس کے لیے ذاتی مفاد ہی نہیں، دیرینہ ذاتی، حتیٰ کہ جذباتی تعلقات تک کو قربان کر دیا۔ مطالعۂ حیاتِ شبلی سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تگ وتاز کا یہی ایک مقصد رہا؛ چنانچہ انھوں نے جو کچھ کہا، جو کچھ لکھا اور جو کچھ کیا، ان تمام کا تعلق مسلمانوں کی بیداری سے تھا۔ نوجوانی میں انھوں نے وکالت کے آزاد پیشے پر قرق امینی جیسی معمولی ملازمت کو ترجیح دی، علی گڑھ میں تدریسی سرگرمیوں کے ساتھ مسلم طلبہ کی تربیت کی طرف متوجہ رہے، روم ومصر وشام کی علمی سیاحت میں اہلِ وطن پیش نظر رہے، علی گڑھ اور دیوبند کے اوصاف کو ندوہ میں یکجا کرنے کی کوشش کی، وقفِ اولاد کا قانون منظور کرایا، اشاعتِ اسلام کا منصوبہ بنایا، نمازِ جمعہ کی رخصت کے لیے تحریک شروع کی، خدام الدین کا آغاز کیا، تصحیح اغلاطِ تاریخی کا صیغہ بنایا، مستشرقین کی طرف سے پھیلائی جانے والی تاریخی غلط فہمیوں کا تدارک کیا، حتیٰ کہ زندگی کے آخری دِنوں میں دارالمصنّفین کی بنیاد رکھی۔ شبلی والد کی دوسری شادی کے باعث پریشان ہوتے ہیں، دوستوں کی بے اعتنائی انھیں رُلاتی ہے، بے روزگاری سے دُکھی ہوتے ہیں، علی گڑھ میں تنہائی محسوس کرتے ہیں، ندوہ میں مخالفوں کا مقابلہ کرتے ہیں، مرحوم والد کے ذمے تیس ہزار روپے

کا قرض اتارتے ہیں؛ لیکن زندگی کے کسی دَور میں مایوس نہیں ہوتے، بلکہ علم و آگہی کی نئی نئی جہتوں اور فکر و خیال کے نت نئے پہلوؤں کے متلاشی رہتے ہیں۔

آج برِ صغیر میں مسلمانوں کی بقا اور ان کی تہذیبی اقدار کے تحفظ میں سرگرمِ عمل اداروں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر علامہ شبلی کے خوابوں کی عملی تعبیر ہیں، اسی لیے شبلی کے خیالات، شبلی کے ارادے، شبلی کی جہد و جہد اور شبلی کے مضبوط اعصاب، یہ سب مزید مطالعات، تحقیقات اور استخراجِ نتائج کے متقاضی ہیں۔

چاہیے تو یہ تھا کہ اہلِ علم، مسلمانانِ برصغیر کے اس عظیم محسن کی سوانح و شخصیت پر پوری توجہ دیتے؛ ان کے قوتِ ارادی، مستقل مزاجی اور مستقبل نگاہی کا راز جاننے کی کوشش کرتے، مگر افسوس کہ شبلی کے سوانح نگاروں کے ہاں بالعموم بعض اکابر اور اداروں کی حمایت اور مخالفت کا جذبہ کارفرما رہا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی سوانح عمری شبلی کی زندگی اور شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہ کر سکی۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر شبلی کے حالات پر ایک دفعہ پھر توجہ دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اوّل اوّل یہ خیال گزرا کہ مکاتیبِ شبلی سے ایسے اقتباسات یکجا کیے جائیں، جن سے حیاتِ شبلی کے بعض گوشے رَوشن ہو جائیں؛ لیکن یہ خیال اتنا طاقتور تھا کہ مکتوبات سے اس کی تشفی نہ ہوئی اور جیسے ہی خطوط کا سلسلہ ختم ہوا، دیگر تصانیف مجھے اپنی جانب متوجہ کر رہی تھیں۔ مَیں شاید تصانیفِ شبلی کے دیباچوں سے اخذ و استفادے پر اکتفا کرتا، لیکن سفر نامۂ روم و مصر و شام کے مندرجات نے تو گویا مجھے جکڑ ہی لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سفرنامے سے استفادے کے بغیر شبلی کی خودنوشت نہ صرف ادھوری رہتی، بلکہ فکرِ شبلی کے کتنے ہی در مقفل رہتے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ شبلی کی بعض اردو اور فارسی نظموں نے اپنی ضرورت کا احساس دِلایا، پھر مقالاتِ شبلی اور خطباتِ شبلی نے اپنی اہمیت کی طرف توجہ دِلائی؛ چنانچہ اپنے مزاج کے مطابق ساحل پر کھڑے رہ کر لہریں گننے کے بجائے گہرے سمندروں کی غواصی کا فیصلہ کیا۔

لوازمہ یکجا ہوا تو اس کی ترتیب پر توجہ ہوئی۔ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، پروفیسر زہرا معین اور محمد حمزہ فاروقی کی مرتبہ آپ بیتیاں پیش نظر رہیں، لیکن ان میں سے کسی کا اندازِ تالیف شبلی کی آپ بیتی کے لیے موزوں نہ تھا؛ چنانچہ طویل غور وفکر کے بعد واقعات کو زمانی اعتبار سے ترتیب دینے کا فیصلہ ہوا، البتہ یہ خیال رہا کہ ایک سال کے دَوران میں رونما ہونے والے واقعات منضبط صورت میں قاری کے سامنے آسکیں۔

اس آپ بیتی کے مصادر میں مکاتیبِ شبلی کو برتری حاصل ہے۔اردو خطوط کے ساتھ ساتھ شبلی کے تینتیس فارسی اور تین عربی خط بھی ملتے ہیں۔شبلی کی تعلیمی زندگی، روزگار کی مشکلات، گھریلو اور روحانی مسائل اور بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ تعلقات کے نشیب وفراز کو سمجھنے میں یہ مراسلت بہت اہمیت رکھتی ہے؛ چنانچہ فارسی خطوں کے متعلقہ اقتباسات کے اردو ترجمے کا فیصلہ کیا گیا۔یہ مسئلہ بھی درپیش تھا کہ شبلی کے متعدد خط تاریخِ تحریر سے بے نیاز تھے اور بعض خط ایسے بھی سامنے آئے، جن پر درج تاریخ درست نہ تھی اور پھر یہی غلطی شبلی کے سوانح نگاروں کے ہاں در آئی، جس سے مزید پیچیدگی پیدا ہوگئی۔اس مرحلے پر میرے دوستوں پروفیسر اشتیاق احمد ظلّی، ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، نوید احمد گل اور ڈاکٹر علی بیات نے بھرپور تعاون کیا، اللہ انھیں جزائے خیر سے نوازے۔

خط بنیادی طور پر مکالمہ ہے، جس میں مخاطبت کا تاثر غیر ارادی طور پر اُبھر آتا ہے اور خطبات اور تقاریر کا خطابیہ ہونا بھی فطری بات ہے؛ جب کہ آپ بیتی خود کلامی سے عبارت ہے۔اب اگر ان تحریروں کو ہو بہو لیا جائے تو مخاطبت کا رنگ غالب آتا ہے اور اگر خالص خود کلامی کو مدِ نظر رکھا جائے تو کئی اہم احساسات مخفی رہ جاتے ہیں۔سچی بات تو یہ ہے کہ اس انتہائی کٹھن مرحلے پر استادِ گرامی (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی) کی دی ہوئی تربیت کام آئی۔

چونکہ شبلی کی زندگی کے متعدد واقعات وسانحات ان کی شاعری کا جزو بن گئے ہیں، لہٰذا ان سے صرفِ نظر ممکن نہ تھا اور پھر یہ بھی ہے کہ ان کی سخنوری نے زیادہ تر فارسی زبان کو ذریعہ بنایا تھا، چنانچہ بعض مقامات پر فارسی شاعری سے استفادہ ضروری تھا۔اگرچہ اردو داں طبقے کو کہیں کہیں فارسی اشعار کی کثرت کھٹکے گی، لیکن ان اشعار کی عدم شمولیت سے شبلی کی

زندگی کے اہم گوشے تاریکی میں رہ جاتے۔ واضح رہے کہ صرف انھی نظموں یا اشعار کو شامل کیا گیا، جن کے زمانہ تخلیق کا علم ہو سکا اور صرف اتنے اشعار سے کام لیا گیا، جو متعلقہ واقعے، احساس یا جذبے سے تعلق رکھتے تھے، یعنی اشعار کا انتخاب فنی معیارات کے بجاے بیانیہ میں ان کی اہمیت کے پیش نظر کیا گیا۔

اس امر کا خیال رکھا کہ شبلی کا کوئی جملہ سیاق و سباق سے ہٹنے نہ پائے اور نہ ہی کوئی غیر ضروری بات اس میں شامل ہو، چنانچہ چند مقامات پر قاری کے نکتہ نظر سے عبارت کی روانی کو برقرار رکھنے کے لیے چند الفاظ یا جملوں کو حذف کرنا پڑا، جب کہ وضاحت طلب امور کو قلابین میں درج کر دیا گیا ہے۔ یقیناً شبلی نے اپنی تحریروں کے ذریعے آپ بیتی لکھنے کی شعوری کوشش نہیں کی تھی، یہی وجہ ہے کہ شبلی کی تحریروں میں ان کی زندگی اور شخصیت کے علمی وفکری ارتقا کے تمام پہلو جگہ نہ پا سکے؛ ایسے مقامات پر بعض شخصیات سے متعلق تعارفی نوٹ اور بعض واقعات کی بابت حواشی وتعلیقات کی ضرورت تھی، لیکن کتاب کی ضخامت میں اضافے اور وقت کی کمی نے اس ارادے کو پنپنے نہ دیا۔ امید ہے کہ یہ ارادہ کتاب کے آئندہ اڈیشن میں روبعمل ہو سکے گا۔

مَیں ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی، جناب محبوب عالم تھابل اور ڈاکٹر ظفر حسین ظفر کا بے حد احسان مند ہوں، جنھوں نے کتاب کے مسودے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور نہایت مفید تجاویز پیش کیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزاے خیر سے نوازے (آمین)۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر ممتاز احمد، پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر طاہر تونسوی، محمد رفیع الدین حجازی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، پروفیسر اکبر علی عظیمی اور شاہ روز نعمانی بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں۔ مرحوم محمد عالم مختارِ حق اس وقت بڑی شدت سے یاد آ رہے ہیں، وہ اس کاوش کو دیکھتے تو یقیناً بہت خوش ہوتے۔

۶ر ستمبر ۲۰۱۲ء

خالد ندیم
+92-321-4433-155
dr.khalidnadeem@gmail.com

اختصارات

[حواشی وتعلیقات میں کتابوں کے نام درج ذیل انداز میں مختصر کر کے لکھے گئے ہیں]

اوّل	مکاتیبِ شبلی اوّل، اشاعتِ اوّل ۱۹۱۶ء
اوّل جدید	مکاتیبِ شبلی اوّل، طبعِ جدید ۲۰۱۰ء
باقیات	باقیاتِ شبلی
جہات	شبلی کی ادبی وفکری جہات
حیات	حیاتِ شبلی
خطبات	خطباتِ شبلی
خطوط	خطوطِ شبلی
دوم	مکاتیبِ شبلی دوم، اشاعتِ اوّل ۱۹۱۷ء
ذکر	ذکرِ شبلی
سفرنامہ	سفرنامۂ روم ومصروشام
کلیات اردو	کلیاتِ شبلی اردو
کلیات فارسی	کلیاتِ شبلی فارسی
مقالات	مقالاتِ شبلی
مکتوبات	مکتوباتِ شبلی
موازنہ	موازنۂ انیس ودبیر
نام	علامہ شبلی کے نام اہلِ علم کے خطوط
نعمان	سیرت النعمان
یادگار	یادگارِ شبلی

۱۸۵۷ء-۱۸۸۱ء

فضل بندول گر تو نشناسی | آدمی نیستی تو نسناسی
نہ تواں یافت ہیچ جاے چو او | خرم و سبز و دلکشاے چو او
ہست از غایت فرح بسرشت | مرغزارے مگر ز باغِ بہشت[۱]

[مَیں ۳ رجون ۱۸۵۷ء کو بندول میں پیدا ہوا۔][۲] علمی شوق والد اور گھر کی تربیت کا اثر تھا۔ خاندان میں علم کا چرچا تھا اور تمام بزرگ مصروفِ علم تھے۔ اُس زمانے کی طالب علمی بہت مشکل تھی، یکہ پر سفر کرتے تھے، پیدل بھی چلنا پڑتا تھا؛ یہ سب مَیں نے خوشی سے گوارا کیا تھا۔ دو دفعہ [طلبِ علم میں] والد کی اجازت کے بغیر چپکے نکل گیا۔ یہ خاص التزام رہا (اور اس میں مَیں منفرد تھا) کہ ہر فن، مثلاً ادب، منطق، حدیث، اصولِ فقہ کے لیے اُنھی علما کے پاس دُور دراز کا سفر کر کے گیا، جو اِن علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے، مثلاً حدیث کے لیے مولانا احمد علی سہارنپوری، ادب کے لیے مولانا فیض الحسن لاہور میں[۳] [اور معقولات کے لیے مولوی محمد فاروق چریا کوٹی][۴]۔

استاذِ مرحوم [مولانا احمد علی سہارنپوری] نے بیس برس کامل بخاری کی تصحیح و تحشیہ میں بسر کیے۔ اُس زمانے کے اکثر بڑے بڑے علماے احناف محدث سہارنپوری کے شاگرد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ عمل اور عمل کے ساتھ دولت کی برکت بھی عطا فرمائی تھی۔ پہلے کتابوں کی تصحیح کی، پھر دوسری تجارتوں میں مصروف ہوئے۔ وہ بے حد منکسر، متواضع اور

۱: شبلی بحوالہ حیات، ۷۸ | ۲: ماخوذ از حیات، ۸۶
۳: بنام شاکر میرٹھی، ۲۳/۹/۱۹۱۲ء، مکتوبات ۱۸۴ | ۴: ماخوذ از مقالات ہشتم، ۴۶

نیک تھے؛ کبھی مسجد میں امامت نہیں کی، چپکے سے مسجد میں جاتے اور جماعت میں شامل ہو کر واپس آجاتے۔ بازار سے سودا خرید کر خود لاتے تھے۔ ایک دفعہ بازار میں مولانا کو میں نے دیکھا تو پیچھے پیچھے ساتھ ہولیا کہ سودا میں لے لوں، مگر مولانا کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے اور خود اپنے ہاتھ سے لے کر گھر واپس آئے۔[۵]

[میرے ایک استاد مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کے] مزاج میں سخت وارستگی، بے پروائی اور بے تکلفی تھی، اس لیے ایک جگہ قیام نہیں کر سکتے تھے، نہ کوئی کام باقاعدہ انجام دے سکتے تھے؛ اسی وجہ سے کوئی بڑی خدمت یا عہدہ نہ حاصل کر سکے، نہ اس کی ان کو پروا تھی۔ علمی ذوق اس قدر غالب تھا کہ سخت سے سخت دنیاوی کشمکشوں میں بھی تعلّم و تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا تھا۔ بے قاعدگی کی وجہ سے کوئی مستقل تصنیف نہیں کی، چھوٹے چھوٹے دو چار رسالے لکھے اور وہ بھی ناتمام رہ گئے۔ تمام مسائلِ علمیہ میں مجتہدانہ رائے رکھتے تھے اور جب کوئی کتاب پڑھاتے تھے تو عموماً مصنف کی غلطیوں اور فروگذاشتوں سے تعرض کرتے تھے۔ میں نے معقولات کی تمام کتابیں، مثلاً میر زاہد، ملا جلال مع میر زاہد، حمد اللہ، شرحِ مطالع، صدرا، شمس بازغہ انھی سے پڑھیں اور میری تمام کائنات انھی کے اِفادات ہیں۔ فارسی کا مذاق بھی ان ہی کا فیض ہے۔ [وہ] اکثر اساتذہ کے اشعار پڑھتے اور ان کے ضمن میں شاعری کے نکتے بتاتے۔[۶]

....

[۱۸۷۲ء میں] مجھے گھر چھوڑے اور اجنبیوں کے ساتھ رہتے دو مہینے ہو رہے ہیں۔ مجھے [والد قبلہ کی طرف سے] پچیس روپے عنایت ہوئے تھے؛ جن میں سے تین روپے اعظم گڑھ سے جونپور تک تانگے کے کرایے پر اُٹھ گئے، سات روپے سہارنپور جانے کے لیے ریل کے ٹکٹ پر صَرف ہوئے اور پانچ روپے وہاں سے لاہور آنے پر؛ یوں دس روپے باقی بچے، یہاں پہنچتے ہی ایک دو روپے حوائجِ ضروریہ پر خرچ ہو گئے۔ چونکہ یہاں رہائش کا کوئی انتظام نہ تھا، مکان ایک روپیہ کرایے پر لیا اور یوں دو ماہ میں دو روپے کرایے پر اُٹھ

۵: شبلی بحوالہ حیات، ۹۹ ۶: مقالات ہشتم، ۴۵

گئے؛ جو باقی بچ رہے، وہ خوراک پر خرچ ہو گئے۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو مَیں نے جس قدر کفایت سے کام لیا، اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ [والد قبلہ کا] مزاجِ عالی کسی قدر برہم تھا، اس لیے خرچ بھیجنے کی زحمت دینے سے باز رہا، [لیکن] اَب مشکل میں ہوں؛ اَور کیا کہوں، تاخیر ہوئی تو مصائب مزید بڑھ جائیں گے۔[7]

چند روز بعد یہاں مدرسے [اورینٹل کالج لاہور] میں [موسم گرما کی] تعطیلات ہونے والی ہیں، جو دو ماہ تک چلیں گی۔ استادِ محترم [مولانا فیض الحسن سہارنپوری] اپنے وطن، یعنی سہارنپور تشریف لے جائیں گے۔ مَیں اتنے دِنوں ناغہ نہیں کر سکتا، اس لیے مَیں نے بھی سہارنپور کا عزم کر لیا ہے۔[8]

....

میرا طالب علمی کا زمانہ تھا کہ ایک دِن ایک صحبت میں کسی نے کلیم کا یہ شعر پڑھا:

سر بہ بستاں چو دہد جلوۂ یغمائی را
اوّل از سرو کند جامۂ رعنائی را

والد بھی تشریف رکھتے تھے؛ مَیں نے کہا، 'کپڑے اُتارنے کو جامہ کشیدن بھی کہتے ہیں، اس لیے شاعر اگر کند کے بجائے کشد کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا۔ جامہ کندن گو صحیح ہے، لیکن فصیح نہیں۔' سب چپ ہو گئے، والد مرحوم نے ذرا سوچ کر کہا کہ 'نہیں، یہی لفظ (کند) شعر کی جان ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق باغ میں جب غارت گری کی شان دِکھاتا ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا لباس اُتار لیتا ہے۔ لباس اُتارنے کے دو معنی ہیں؛ ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اُتار کر رکھ دے یا اس کا نوکر اُتار لے، دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اُتروا لیے جائیں یا نچوائے جائیں۔ فارسی میں ان کے لیے دو مختلف لفظ ہیں؛ جامہ کشیدن اور جامہ کندن۔ چونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ معشوق ذلت کے طور پر سرو کا کپڑا اُتار لیتا ہے، اس لیے یہاں جامہ کندن کا لفظ جامہ کشیدن سے زیادہ موزوں ہے۔'[9]

۷: بنام شیخ حبیب اللہ، ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء، دوم ۲۶۷
۸: بنام شیخ حبیب اللہ، ت ن، دوم ۲۶۸
۹: شعر العجم چہارم، ۱۲

[۱۸۷۶ء میں والد قبلہ کی معیت میں] دَورانِ حج میں جب مجھے عربی میں گفتگو کرنی پڑی تو نحو کی پوری پابندی کرتا اور گفتگو میں بھی اِعراب کا پورا پورا لحاظ کرتا، یہ دیکھ کر [ایک عرب] جمال نے آخر ایک روز کہا کہ یا شبلی! انت نحوی۔ مَیں نے بوجہ ناواقفیت، پہلے اس کو اپنی علمی لیاقت پر محمول کیا؛ مگر بعد کو پتا چلا، یہ تعریض تھی، نہ کہ تحسین۔[۱۰]

فنونِ حدیث کا جو ذخیرہ وہاں [مدینہ میں] دیکھا، کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آیا۔ مَیں نے مدینہ منورہ میں اس [ابنِ عبدالبر کی التمہید] کا نسخہ دیکھا ہے۔[۱۱]

اے بکرم کار جہاں کردہ ساز مر ہمہ را پیشِ تو رُوے نیاز
چوں بدرت آمدہ ام با امید از کرم خویش مکن نا امید
چوں بدرت آمدہ ام امیدوار سایۂ لطفے ز سرم برمدار[۱۲]

....

[۱۸۷۷ء میں] فرصت کے لمحات میں ادب کا مطالعہ کر رہا ہوں، کسی نئی چیز کا متلاشی ہوں اور کسی کو دیوانِ حماسہ پڑھا رہا ہوں۔ مَیں نے عزمِ سفر کا اظہار کیا تھا، البتہ منزل کا تعین ابھی تک نہیں کر سکا۔ لکھنؤ چلا جاؤں؛ جب تک چلا نہ جاؤں، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

[روس کے مقابلے میں ترکوں کی امداد کے لیے] اس شہر [اعظم گڑھ] میں چندے کی مَد میں دو ہزار چھ سو روپے جمع ہو گئے ہیں، قوی امید ہے کہ یہ تین ہزار تک پہنچ جائیں گے۔ اللہ کا شکر ہے کہ نامراد روسی فوجیں، جو عثمان پاشا کے ساتھ برسرِ پیکار تھیں، ان میں سے آٹھ ہزار روسی واصلِ جہنم ہوئے اور چوبیس ہزار شدید مجروح۔ فتح وظفر کی ہواؤں سے سلطانی پرچم جھوم رہا ہے اور شاہِ روس کا بھائی گرینڈ ڈیوک نکلسن ترک جانبازوں کے تابڑتوڑ حملوں کے خوف سے میدان چھوڑ کے بھاگ نکلا ہے۔[۱۳]

....

چندروز ہوئے، یہاں ایک طرحی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا، مَیں نے بھی ایک

۱۰: شبلی، بحوالہ حیات، ۱۰۵ ۱۱: ایضاً، ۱۰۴
۱۲: ایضاً ۱۳: بنام مولوی حکیم محمد عمر، ت ن، دوم ۲۷۲-۲۷۳

غزل پڑھی تھی:

ناتواں عشق نے آخر کِیا ایسا ہم کو
غم اُٹھانے کا بھی باقی نہیں یارا ہم کو

درد و فرقت سے ترے ضعف ہے ایسا ہم کو
خواب میں بھی ترے دُشوار ہے آنا ہم کو

جوشِ وحشت میں ہو کیا ہم کو بھلا فکرِ لباس
بس کفایت ہے جنوں دامنِ صحرا ہم کو

رہبری کی دہنِ یار کے جانب خط نے
خضر نے چشمہ حیواں یہ دِکھایا ہم کو

دل گرا اُس کی زَنَخداں میں فریب خط سے
چاہ خس پوش تھا ، اے واے! نہ سوجھا ہم کو

واہ کاہیدگیِ جسم بھی کیا کام آئی!
بزم میں تھے پہ رقیبوں نے نہ دیکھا ہم کو

قالبِ جسم میں جان آ گئی گویا شبلی
معجزہ فکر نے اپنی یہ دِکھایا ہم کو

ایک اَور غزل بھی ہوئی ہے، اس غزل کا صرف ایک شعر:

یوں چشم تر میں قامتِ جاناں ہے جلوہ گر
جس طرح سے کہ سرو لبِ آب جو رہے[۱۴]

....

میری بدنصیبی کہ مجھے قانون پڑھنا پڑا ہے، سلیم سمروی بھی میرے ساتھ ہیں۔[۱۵]

....

[آج کل] مولوی فقیر اللہ صاحب بھی مجھ سے رنجیدہ ہیں۔ یا رَب! دوستوں کو کیا

۱۴: ایضاً، ۲۷۳ ۱۵: بنام مولوی حکیم محمد عمر، ت ن، دوم ۲۷۴

ہو گیا ہے کہ انھیں سب خستہ حالوں سے ہمدردی ہے، مگر شبلی کتنا بدنصیب ہے کہ مولوی محمد عمر صاحب جیسا دوست بھی اس سے بیزار ہے؛ تاہم میری زبان پر یہی دعا ہے کہ شبلی رہے نہ رہے، [میرے] سب [دوست] عافیت سے رہیں۔[۱۶]

....

[۱۸۷۹ء میں قانون کا امتحان دیا، ایک دِن قانون کے ممتحن] کالون صاحب سے اچانک ملاقات ہوگئی، وہ میرے اور میرے خاندان سے متعلق پوچھتے رہے اور مَیں ایک ایک کر کے بتاتا رہا۔ وہ بڑی تعظیم سے پیش آئے، البتہ معذرت کی کہ 'اس سال تو مَیں اردو کے پرچے نہیں دیکھ رہا'۔ غم زدہ واپس آیا اور دیوانِ غیب [حافظ شیرازی] سے فال نکالی تو یہ شعر نکلا:

آنچہ سعیست من اندر طلبت بنمودم
ایں قدر ہست کہ تغییر قضا نتواں کرد

نا امیدی کا خیر مقدم کیا اور گھٹنوں پر سر رکھ کے بیٹھ گیا۔ دل میں سوچا کہ اتنی آزادی کے باوجود ایک شعر سے اثر قبول کرنا اور آرزو کا کاسہ مایوسی کے سر پر دے مارنا کیسا؟ لیکن جب سر پر پتھر آن ہی پڑے اور دل مایوسیوں سے بھر جائے تو کیا کِیا جا سکتا ہے؟ دو تین سال سے مَیں نے دوسروں سے توقع رکھنا ہی چھوڑ دی ہے اور کسی سے کچھ ملا بھی نہیں۔

میرے اعزّہ کہتے ہیں کہ انگریزی کے بغیر گزارا نہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے! کتنے ہی لوگ ہیں، جو انگریزی کا ایک حرف نہیں جانتے، لیکن بڑے بڑے مناصب پر فائز ہیں، آخر تحصیل داری وغیرہ کے لیے بھی تو انگریزی کی شرط نہیں۔ فی الجملہ مَیں تو آسمان کا ستایا اور تقدیر کا مارا ہوں، مَیں نے عمر کا بڑا حصہ بادیہ پیمائی اور ہرزہ درائی میں گزار دیا۔ اب عزمِ سفر ہے، دیکھنا یہ ہے کہ پردۂ چرخ میں کون کون سی بجلیاں پوشیدہ ہیں۔[۱۷]

....

۱۶: ایضاً، ص ۲۷

۱۷: بنام مہدی حسن، ت ن، دوم ۰۷-۲۷۱

والد اور تمام خاندان کی مرضی، بلکہ حکم تھا کہ مَیں علمی مشاغل چھوڑ کر وکالت اور ملازمت کروں، چنانچہ مجبور ہو کر امتحان دیا [لیکن ناکام ہو گیا، البتہ دوسری دفعہ کوشش کی] [۱۸] اور کامیاب ہوا۔[۱۹]

....

شاید [مولوی محمد عمر کی طرف سے] دوستی کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ دوستوں کی چپ نے تو مجھے پریشان کر دیا ہے۔ مَیں ان دِنوں پوری توجہ سے [بعض] لوگوں کو پڑھانے میں مصروف ہوں۔ [دیوانِ] ظہیر فاریابی کا مجھے شدت سے انتظار ہے۔[۲۰]

....

[اکتوبر ۱۸۸۱ء میں والد صاحب قبلہ کے ساتھ اپنے بھائی مہدی سے ملنے علی گڑھ کالج گیا تو سرسید کی خدمت میں درج ذیل عربی قصیدہ پیش کیا]:

المجد یصحب علما حیثما یصل

والعلم عن قومنا لازال یرتحل

[بزرگی جہاں جہاں جاتی ہے، علم کو بھی ساتھ لے جاتی ہے، حالانکہ علم ہماری قوم سے رخصت ہو رہا ہے][۲۱]

نالوا من الذّل مالا ناله احد

اذ لا یری فیهم علم و لا عمل

[ہماری قوم کو وہ ذلت حاصل ہے، جو کسی کو حاصل نہیں ہوتی تھی، کیونکہ ان میں نہ علم نظر آتا ہے، نہ عمل]

و لا تزال تری ینشتُّ شملهُم

فی کُلّ یومٍ و قد ضاقت بهم حیل

[ان کا شیرازہ بکھر رہا ہے اور ان کے لیے تمام راستے بند ہو گئے ہیں]

۱۸: ماخوذ از حیات، ۱۱۸-۱۱۹

۱۹: بنام شاکر میرٹھی، ۱۹۱۲/۹/۲۳ء، مکتوبات ۱۸۴

۲۰: بنام مولوی محمد عمر، ۱۸۸۱/۳/۱۷ء، دوم ۲۷۷-۲۷۸

۲۱: عظمت و بزرگی، علم کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور ہماری قوم کا یہ حال ہے کہ علم اس سے برابر رخصت ہوتا جاتا ہے۔ (مترجمہ ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی)

لا یرغبون الی ما کان ینفعهم

فحلّ صنُعتهم للغی والخطل

[مفید چیزوں کی طرف ان کا میلان بھی نہیں ہے، ان کا تمام تر کارنامہ گمراہی اور پریشان رائی ہے]

تراهم الیوم فی کأبٍ و فی قلقٍ

فلا افاد فتیلا ما به اشتغلوا

[آج تم ان کو رنج وغم میں مبتلا دیکھ رہے ہو، ان کے مشاغل نے ان کو ذرہ بھر بھی فائدہ نہیں پہنچایا]

لا ینتهون و قد ذاقوا وبالهم

عن سوء صنعٍ فقد باؤا بما عملوا

[باوجودیکہ اپنی بداعمالیوں کا مزہ چکھ چکے، لیکن ان سے باز نہیں آتے؛ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے اعمال کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں]

و هل یجازیهم الا بما اکتسبوا

من کان من عنده الاحکام تنفصل

[خدا، جو معاملات کا فیصلہ کرتا ہے، کیا اس کے سوا ان کو اور کوئی معاوضہ دے سکتا ہے]

فمن سعی الیوم فی اصلاح حالهم

فاللّٰه جازیه یوم یقطع الامل

[پس جس شخص نے ان کی اصلاح کے لیے کوشش کی، خدا اس کو قیامت میں صلہ دے گا]

ان کنت تسئلنی من هذه صفته

قلت الامام الهمام السید البطل

[اگر تم مجھ سے پوچھو کہ وہ کون ہے؟ تو مَیں کہوں گا، امام، سردار، بہادُر، سید]

هو الّذی فاق فی الآفاق منزلةً

و نال ما لم تنله الاعصر الاوّل

[وہ، وہ ہے کہ تمام ملک میں بلند رُتبہ ہوا اور وہ بات حاصل کی، جو قدما کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی]

من اقبل الدین و الدنیا علیه معا

و الآن فی نجحِ ما قد رام مشتغلٌ

[جس کو ایک ساتھ دین و دنیا دونوں ملے اور اب تک اپنے مقاصد کی کامیابی میں مشغول ہے]

نال المکارم من آبائه و مشیٰ

فی المکرمات علی اٰثار ما فعلوا

[اپنے آبا و اجداد سے فضائل حاصل کیے اور اس شاہراہ میں ان کے نقش قدم پر چلا]

فجدّه سیّد الاعراب و العجم

قد قال یا امتی لمّادنا الاجل

[اس کے دادا عرب و عجم کے سردار تھے اور ان کی موت کا وقت آیا تو صرف اُمتی کا لفظ ان کی زبان سے نکلا]

و هکذا صُنُعُ هذا السیّد العلم

یقول یا لهفَ قومی سِیٔ ما عملوا

[اسی طرح اس نامور سید نے کہا کہ افسوس! میری قوم نے جو کچھ کیا، بُرا کیا]

یا خیر من سیط حب القوم من دمه

احسِن و لا تبتئس من سوء ما عملوا

[اے ان لوگوں میں بہتر! جن کے خون میں قوم کی محبت پیوست ہوگئی ہے، عمدہ کام کرو اور جو برائیاں قوم نے کیں، ان سے غم زدہ نہ ہو]

احسن الیهم و لو جازوك سیئةً

و لا تبال بما قالوا و ما فعلوا

[ان کے ساتھ احسان کر، گو وہ تیرے ساتھ برائی کریں اور جو کچھ وہ کہیں اور جو کچھ کریں، اس کی پروانہ کر][۲۲]

۲۲: شبلی بحوالہ حیات، ۱۲۲- ۱۲۳ (اردو ترجمہ از سید سلیمان)

۱۸۸۲ء

آشفتہ سری اور شوریدہ مزاجی کے باعث میری حالت اتنی بگڑ گئی ہے کہ آج کل مجھے کچھ نہیں سوجھتا۔ میری خوش طالعی و خوش بختی خس و خاشاک میں مل گئی ہے؛ مگر مَیں جانتا ہوں یا میرا خدا کہ مَیں جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرنے کے بجائے کڑھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ وہ چند سانسیں، جو بارگاہِ ایزدی سے مجھے ودیعت ہوئی ہیں، یہ انھی کی سزا ہے کہ اس قسم کے کام کرنا پڑ رہے ہیں۔ دوسرے میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں [پتا نہیں]، البتہ مَیں خود اپنے بارے میں یہ سوچتا رہتا ہوں کہ کیا مَیں وہی شبلی ہوں، جو کبھی ہوا کرتا تھا؟ قسمت نے یاوری کی تو (اِن شاءاللہ) پھر وہی شبلی بن کر دِکھاؤں گا۔ دو ماہ تک مجھے [قرق] امینی کرنی پڑی، اس دَوران مجھے روز و شب کی بھی خبر نہ رہی اور مَیں نے سخت مشقت سے کام لیا۔ اگرچہ اس پُرخطر راہ پر مَیں دو قدم ہی چل سکا اور اس میں مجھے ہر کس و ناکس سے تعلق بھی رکھنا پڑا، مگر بایں ہمہ مَیں اپنے مقصد کو نہ پا سکا اور مجھے اپنے مقصد سے دستبردار ہونا پڑا۔ یہ سب کچھ مَیں کسی کو بتا نہیں سکتا، کیونکہ میرے پاس میری اس حالت کا کوئی گواہ بھی نہیں۔ استغفراللہ! بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میری دِماغی حالت نے میرا صبر تک چھین لیا ہے[1]

....

مَیں اسی طرح خلق ہوا ہوں کہ حصولِ علم و فضل کا جذبہ میرے خون میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ جیوں یا مروں، یہ جذبہ باقی رہے گا؛ تاہم مَیں اپنی اس معمولی ملازمت [قرق امینی] کے بارے میں جتنا غور کرتا ہوں، اتنا ہی میرا حزن و ملال بڑھتا جاتا ہے۔ پس، صبر ہی خوب ہے اور اللہ مجھے کافی ہے اور وہی کارساز ہے[2]

۱: بنام محمد سمیع، ۱۸۸۲/۸/۲۵ء، دوم ۲۸۲ ۲: بنام نامعلوم، ت ن، دوم ۲۹۲

[نیل کے کارخانے کے] گودام اور اس کے متعلقات کو دیکھتا تھا، چاہے مَیں اس قابل تھا یا نہیں۔ چونکہ یہ حضرت [والد] قبلہ گاہ کا حکم تھا، اس لیے بجا آوری کے سوا چارہ نہ تھا۔ اب کہیں جا کر اس بیگار سے جان چھوٹی ہے، مَیں واپس آ گیا ہوں۔ اِن شاء اللہ جلد ہی تذکرۃ [المنتھی فی ردِّ اسکات المعتدی] کا جواب مکمل کر دوں گا۔ کچھ دوستوں کے خیال میں حافظ صاحب کے افکار پر مبنی دو رسالے اَور بھی ہیں۔ اب تک تو مجھے حافظ صاحب کے علم و استعداد پر اعتماد تھا، مگر یہ کام اُن کے مطالبے پر ہی ہو گا۔ اِن شاء اللہ جلد ہی غازیپور جاؤں گا اور مصنفِ تذکرہ کی اغلاط اور کوتاہیوں کے ازالے پر بات کروں گا۔ اس بار اس سفر میں حافظ حبیب اللہ خاں اور عزیزی مولوی محمد سمیع بھی میرے ساتھ ہوں گے۔[۳]

....

دل خون کے آنسو رو رہا ہے، اس کمینہ خصلت آسمان پر افسوس! مجبوراً مجھے اپنے لیکچر مولوی لطیف الرحمٰن وغیرہ کو دینا پڑے۔ بُرا ہو آسمان کا کہ مجھے انھی لوگوں سے کام آن پڑا۔ مفتی محمد یوسف صاحب آج کل مجھے یہ شعر سناتے رہتے ہیں:

از ہجومِ چغد در ویرانۂ ما جا نماند
آں قدر آباد شد آخر کہ ما می خواستیم[۴]

....

ہر کسی کو دشمن سے تکلیف پہنچتی ہے، مگر بد قسمتی سے مجھے تو میرے دوستوں نے ان حالوں تک پہنچایا ہے۔ انصاف کی کہنا، جب دوست ہی دغا دینے لگیں تو دنیا میں اس سے زیادہ خرابی کیا ہو سکتی ہے! زندہ رہنا اور پل بھر کو آرام کرنا کیسے نصیب ہو سکتا ہے! اس پر ایک اَور حادثے نے تو میرا دِل بالکل چھلنی ہی کر دیا، مَیں اپنا دِل چیر کر کسے دِکھاؤں؟ افسوس کہ میری اپنی ہی سادگی نے میرا جینا محال کر دیا ہے۔ مانا کہ سادہ لوحی کی وجہ سے میرے ساتھ دغا ہوا ہے؛ خود ہی مجھ سے وعدہ کیا اور خود ہی اسے توڑ دیا؛ افسوس! مَیں یہ روگ کیوں پال

۳: بنام مولوی محمد عمر، ۱۸۸۲/۱۰/۷ء، دوم ۲۷۸-۲۷۹　　۴: بنام مولوی محمد عمر، ۱۸۸۲/۱۱/۵ء، دوم ۲۸۱

رہا ہوں۔[۵]

چچا جان موصوف شیخ حبیب اللہ نے حیران کر دیا کہ [میری عربی تصنیف] اسکات المعتدی [علی انصات المقتدی] کی اشاعت کا سارا خرچہ اپنے ذمے لے لیا، جب کہ باقی رقم حافظ حسرت صاحب سے لینی تھی، جو ابھی تک وصول نہیں ہوئی، اسی وجہ سے اسکات کی چھپائی میں تاخیر ہوتی جا رہی ہے۔[۶]

۵: بنام محمد سمیع، ت ن، دوم ۲۸۳-۲۸۴

۶: بنام محمد سمیع، ت ن، دوم ۲۸۶

۱۸۸۳ء

وکالت اور ملازمت سب چھوڑ دی اور علمی مشاغل میں مصروف ہوا اور اس لیے معمولی معاوضے پر اوّل علی گڑھ کی پروفیسری [قبول] کی [۴۰ ؍روپے] ماہوار پر[1]

....

[۲؍فروری] تک تو مَیں ڈپٹی محمد کریم کے دولت کدے پر اقامت پذیر رہا، [البتہ] کل ہی ایک مکان کرایے پر لیا ہے، مگر چونکہ دل خواہ نہیں ہے، اس لیے فکر سے آزاد نہیں ہوا اور مزید تلاش جاری ہے۔

یکم فروری سے کالج جا رہا ہوں۔ ایف اے و بی اے کو فارسی اور انٹرس وسیکنڈ [کے طلبہ] کو عربی پڑھاؤں گا۔

سید صاحب ہر چند کلکتہ سے یہاں پہنچ گئے ہیں، لیکن چونکہ سفر کی تھکن کے باعث ان کی طبیعت ناساز ہے، اس لیے ابھی تک ان کے نیاز حاصل نہیں ہوئے۔ [وہ] عزیزی محمد اسحاق کو پہلی صف میں جگہ دیتے ہیں[2]

....

صبر کا دامن چھوڑنے اور آسمان سے جھگڑے میں جیت بالآخر صبر اور آسمان ہی کی ہوتی ہے، تو پھر فائدہ! چنانچہ مَیں نے تو ہونٹ سی لیے، دانت بھینچ لیے، سر گھٹنوں پر رکھ لیا اور چپ سادھ لی۔

آج [۱۰؍فروری] تک تو مَیں ڈپٹی صاحب کے گھر پر ہی تھا، ابھی دو تین روز ہوئے، ایک بہت اچھا مکان پانچ روپے ماہانہ کرایے پر لے لیا ہے۔ مکان اگرچہ کالج سے کافی دُور

۱: بنام شاکر میرٹھی، ۲۳؍۹؍۱۹۱۲ء، مکتوبات ۱۸۴-۱۸۵ ۲: بنام مہدی حسن، ۲؍۲؍۱۸۸۳ء، دوم ۲۷۱

ہے، مگر کیا کرتا، کالج کے قریب کوئی مکان ملتا ہی نہیں تھا۔

آج کل درۂ نادرہ اور [دیوان] عرفی پڑھ رہا ہوں۔ یہاں مجھے میرزا صائب کا ایک رزمیہ ہاتھ لگا ہے، مگر افسوس کہ دو صفحے سے زیادہ نہیں۔[۳]

....

جو دن طلوع ہوتا ہے، میرے درد وغم میں اضافہ کرتا جاتا ہے، لیکن یہ دل اَور کر بھی کیا سکتا ہے! جب تک یہاں ہوں، یہ ذلت تو برداشت کرنا ہی ہوگی۔ ابھی قسمت کو کیا منظور ہے، کچھ معلوم نہیں۔ مَیں تو اَب صرف بامرِ مجبوری بات کرتا ہوں، ورنہ خاموش رہتا ہوں۔

[علی گڑھ میں آج کل] نجدیوں [یعنی غیر مقلدوں] نے ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے اور [جواب دینے کے لیے] بھائی فقیر اللہ بھی اُن کے سر پر نہیں پہنچے۔ اس پر مَیں حیران ہوں۔[۴]

....

مَیں [علی گڑھ میں] جس مکان میں رہتا ہوں، شہر کے کنارے پر ہے۔ یہ مکان ایک مختصر سا، مگر خوش قطع مکان ہے۔ دکھن کی طرف ایک خوش نما محراب دار چھوٹا سا دالان ہے، اس میں خاص مَیں رہتا ہوں۔ ایک جانب پلنگ ہے اور زمین پر صاف اور پاکیزہ چاندنی کا فرش کھنچا ہوا ہے۔ صدر مقام کے دائیں جانب ترکی جانماز اور سامنے ایک رنگین اور ہلکا سا ڈسک رکھا ہوا ہے۔ دیوار پر لیمپ جڑا گیا ہے، جو شب کو دیر تک روشن رہتا ہے۔ اسی دالان کے متصل ایک جانب ایک حجرہ ہے، جس میں مولوی عبدالغفور صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ اسی دالان کے مقابل دوسری جانب ایک گول کمرہ ہے، جو عزیزی اسحاق کی سکونت کی جگہ ہے اور جو کرسیوں اور میز سے آراستہ ہے۔ کمرے کے متصل جو حجرہ ہے، وہ عزیزی محمد عثمان کے رہنے کی جگہ ہے۔ میرے مکان سے متصل خواجہ محمد یوسف کا مکان ہے اور وہیں ایک شاعر مشہور، جو سارے شہر کے استاد اور واقعی سخن سنج اردو ہیں، رہتے ہیں۔ مجھ سے اکثر ملتے ہیں اور قیس تخلص کرتے ہیں۔ خواجہ محمد یوسف سے لطف کی ملاقات رہتی ہے۔ مولوی سمیع اللہ خان سے بھی ملتا رہتا ہوں اور بفضلہٖ عمدہ طور سے ملتے ہیں۔ میر اکبر حسین

۳: بنام محمد سمیع، ۱۸۸۳/۲/۱۰ء، دوم ۲۸۶ ۴: بنام محمد سمیع، ۱۸۸۳/۲/۲۱ء، دوم ۲۸۷

صاحب منصف سے تو خوب چھنتی ہے۔ میرے فارسی اشعار انھوں نے سنے اور داد دی۔ مدرسے کے لڑکے بھی میری جماعت کے مہذب اور سخن فہم ہیں۔

افسوس کہ میرے قصیدے کی متعدد کاپیاں نہیں۔ ایک پرچہ، جو میرے پاس تھا، وہ اس قدر سارے مدرسے میں ہفتوں تک دست بدست پھرا کہ مل دل کر پُرزے پُرزے ہوگیا۔ اگرچہ بہت لوگوں نے اس کی نقلیں بھی کرلیں، مگر چھپا ہوتا تو خوب ہوتا۔ مرثیہ، جن لوگوں نے اس کی فارسی دیکھی ہے، ازبس پسند فرمائی ہے۔ میر اکبر حسین صاحب بھی ان میں داخل ہیں۔

یہاں ایک شخص عبدالحمید نامی اہلمد ار محکمہ کلکٹری ہیں۔ یہ صاحب دیوان ہیں اور کتابوں کے بڑے شائق۔ ان کو دعویٰ تھا کہ کوئی دیوان وغیرہ فارسی کا ایسا نہیں، جو چھپا ہو اور میرے پاس نہ ہو؛ مَیں نے ان کو بہت سی کتابیں لکھوادی ہیں۔ یہ خوب آدمی ہیں، ان کے ذریعے سے کتابیں دیکھنے کو خوب ملتی ہیں، یہ بے چارے فخریہ کتابیں بھیج دیا کرتے ہیں۔[۵]

....

[عربی اشعار کی اصلاح کے حوالے سے] جو خدمت [سرسید احمد خان کی طرف سے] مرحمت ہوئی، وہ میری وقعت کی حد سے زیادہ ہے۔ اشعار غالباً بحر ہزج مسدس میں لکھے گئے ہیں اور اس میں صرف دوز حاف قصر و حذف واقع ہوتے ہیں، مگر تین مصرعوں کا وزن درست نہیں یا شاید مجھی کو غلطی ہوئی ہے۔ جو تغیر اس میں کیا گیا ہے، وہ اِس وجہ سے ضروری تھا کہ صنعت اقتباس محفوظ رہے اور اس لحاظ سے ایک شعر اَور مزید کہا گیا ہے۔ مَیں اپنی خدمت کو پوری طرح سے ادا نہیں کرسکا، مگر میری وسعت میں اسی قدر تھا:

تعالیٰ شان مدرسة العلوم — و جاء کما تراه هدیً لقوم
و اسّسَ اصله یوم البناء — علی التقوی ، فینمو کلَّ یوم
و کان القوم قد ناموا یلیاً — و لکن اوقظوا ، من بعد نوم[۶]

....

مَیں ۲۴ر مئی ۱۸۸۳ء کو یہاں [علی گڑھ] سے رختِ سفر باندھوں گا اور خدا نے چاہا تو

۵: بنام محمد سمیع، ۲۸/۴/۱۸۸۳ء، اوّل ۵۶-۵۷
۶: بنام سرسید، ۴/۵/۱۸۸۳ء، مکتوبات ۱۸

۲۷ رمئی تک عزیزانِ وطن [اعظم گڑھ] سے آن ملوں گا۔ کچھ دیر لکھنؤ میں رُکنا چاہتا ہوں، وہاں صرف اسحاق اور نصیر ہی میرے ہم مزاج ہیں۔ یہاں پر ایک طرحی مشاعرے کا اہتمام کیا جا رہا ہے، احباب کے کہنے پر اس غزل کے ساتھ مَیں بھی اس میں شامل ہو رہا ہوں:

شبلیِ خستہ ز غربت بوطن مے آید
یا مگر مرغِ چمن سُوے چمن مے آید[7]

....

تصانیف کا شوق ابتداءً مجھ کو ان تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا، جو یورپ میں چھپی ہیں، جن کو مَیں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ سرسید نے مجھے اپنے کتب خانے کی کتابوں کو دیکھنے کی عام اجازت دے دی تھی تو میرا یہ حال تھا کہ الماریوں کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہتا، کبھی تھک کر زمین ہی پر اکڑوں بیٹھ جاتا، سرسید نے جو یہ کیفیت دیکھی تو سامنے کرسی رکھوا دی[8]۔ اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے۔ سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیہ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں، جن کی حقیقت مَیں تو کیا، بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے، مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئیں۔ گبن صاحب کی تاریخ [عروج و زوالِ سلطنتِ روما]، جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپے کے صرف سے کرایا ہے، میرے مطالعے میں ہے۔[9]

....

جو خفیف رقم [اعظم گڑھ سے سرسید احمد کو] مَیں ارسال کرتا ہوں، اس کی نسبت مجھ کو انتظار تھا کہ وہ ایک معتدبہ رقم کے ساتھ ارسال مرسل ہوگی، مگر میری جسمانی اور اہلِ شہر کے روحانی ضعف کی وجہ سے اس میں تعویق ہوئی۔ [۱۸۸۳ء کے دسمبر کا] مہینا لبِ بام تھا، مجبوراً اپنا چندہ بھیجتا ہوں۔ مَیں نے مجبوری سے تعطیل تک کی رخصت کی عرضی پرنسپل کی خدمت میں ارسال کی ہے، مگر حیرت ہے کہ جواب نہیں آیا۔[10]

....

۷: بنام محمد سمیع، ۱۸۸۳/۵/۲۰ء، دوم ۲۸۸
۸: شبلی بحوالہ حیات، ۱۳۵
۹: بنام محمد سمیع، ۱۸۸۳/۹/۱۹ء، اوّل ۶۰
۱۰: بنام سرسید، ۱۸۸۳/۹/۱۹ء، مکتوبات ۱۸-۱۹

یہاں [علی گڑھ کالج میں] آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے، معلوم ہوا کہ انگریزی خواں طبقہ نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو؛ خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں۔ یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا۔ بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے۔ سید صاحب نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں، جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے؛ صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دِماغوں میں کچھ تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔[۱۱]

....

آج جو شخص یا جو گروہ اس پیارے ہادیؐ کی پیروی کا دعویٰ رکھتا ہے، اس کا پہلا فرض ہے کہ زمانے کی موجودہ ضرورتوں کو سمیٹتے ہوئے مذہب کی ترقی میں کوشش کرے۔ علماے اسلام کی نسبت کہا جاتا ہے کہ نائبِ رسول اللہ ہیں، اس لیے میرا رُوے سخن خاص ان کی طرف ہے۔ [اے علماے اسلام!] زمانے نے جو نیا بہروپ بھرا ہے اور جس موجودہ صورت میں وہ نیرنگیاں دِکھلا رہا ہے، وہ بالکل ایک اجنبی اور غیر مانوس تصویر ہے۔ اس نے جو نیا باز و کھولا ہے، وہ بھی نئی پرواز کا ہے۔ جن چیزوں کو ہم متاعِ پیش پا اُفتادہ خیال کرتے تھے، اس کا دام چڑھا جاتا ہے، ہمارے فضل و کمال کا دفتر ڈھونڈنے سے ردّیوں میں ملتا ہے۔ اگر اس حالت میں ہم موجودہ زمانے کا ساتھ نہ دیں تو کیا پچھلا زمانہ ہماری حمایت و غم گساری کے لیے واپس آنا گوارا کر سکتا ہے؟ [درسِ نظامی کا] طریقہ تعلیم بالکل بے سُود ہے۔ یہ خیال کہ موجودہ طرزِ تعلیم ایک مذہبی تعلیم ہے، کس قدر غلط ہے۔ درسِ نظامیہ میں یونانی فلسفے کی جس قدر کتابیں رکھی گئی ہیں، کیا دینیات کی کتابیں تعداد میں ان کے برابر ہیں؟ ہمارے علما کبھی اپنی چار دیواری سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ ان کو کیا معلوم ہے کہ سرکاری نوکریوں میں مسلمانوں کا حصہ بہت کم ہوتا جاتا ہے، ان کو کچھ بھی خبر ہے کہ ہر ایک

۱۱: بنام محمد سمیع، ت ن، اوّل ۵۴

انجمن میں مسلمانوں کی کرسیوں کے لیے جگہ باقی نہیں رہی۔اخبار وہ نہیں دیکھتے، ملک میں جو پولیٹیکل انقلاب ہوتے رہتے ہیں، وہ اس سے خبردار ہونا نہیں چاہتے؛ پس ان کی حالت کے ترقی کر جانے کی اُمید کیا ہوسکتی ہے۔اے میرے پاک خدا! اگر ہم لوگوں کی ذلت میں کوئی مرحلہ باقی رہ گیا ہو تو ہم نہیں چاہتے کہ وہ نہ طے شدہ رہ جاوے، مگر اس اُمید پر کہ جو کچھ ہونا ہو، جلد ہو لے۔مر جانے کو ہم آمادہ ہیں، مگر پھر زندہ ہونے کی اُمید پر؛ اجڑ جانے کے لیے ہم تیار ہیں، مگر نئے سرے سے آباد ہونے کے خیال میں[۱۲]

۱۲: باقیات، ۱۴، ۱۷

۱۸۸۴ء تا ۱۸۸۵ء

مَیں بروز سوموار ۱۴ جنوری کو علی گڑھ پہنچ گیا، لیکن سفر کی تھکان کے باعث آرام کرتا رہا۔ اس مرتبہ عزیزوں میں سے کوئی ساتھ نہ تھا، لہٰذا بات کس سے کرتا؟ دِل کی بھڑاس کیسے نکالتا؟ ایک انجانا سا خوف طاری رہا اور دِل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے رہے۔ وہ تمام باتیں، جو عزیزوں نے وطن سے چلتے وقت کہیں، یاد آتی اور خون رُلواتی رہیں۔ آنکھوں میں وہ منظر گھومتا رہا کہ دوستوں کی محفل جمی ہوئی ہے اور ہر کوئی اپنی اپنی سنا رہا ہے کہ اچانک کوئی پوچھتا ہے کہ جب شبلی کو علی گڑھ میں کامیابی حاصل ہو چکی تو کس مجبوری کے تحت اسے چھوڑنا اور حاسدوں کے لیے [تمسخر کا] بہانہ بنانا چاہتا ہے۔ مَیں کبھی تو خاموش رہتا ہوں اور کبھی چِلّا اٹھتا ہوں کہ یارو! انصاف سے کام لو؛ میرے اختیار میں کچھ نہیں، میری غلطیوں پر گرفت نہ کرو۔ مجھے بھی معلوم ہے کہ [علی گڑھ کی] یہ کم مایہ خدمت میرے لائق نہیں اور اگر اپنے موجودہ منصب کے حوالے سے کچھ کہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس سے بہتر چاہیے؛ مگر کیا کِیا جائے کہ والد صاحب قبلہ وکالت کے سوا کسی چیز پر راضی نہیں اور اگر مجھ آزادہ رَو کو وکالت پسند نہیں تو انصاف کرو، اس میں کون سا گناہ ہے؟ مَیں جب تک والد صاحب قبلہ کے زیرِ سایہ رہوں گا، اسی وضع پر رہوں گا۔ افسوس اُس وقت پر، جب تقدیر بگڑ جائے گی اور اختیار چھن جائے گا۔ اگر مَیں بادلِ نخواستہ وکالت اپناؤں تو مجھے اپنی حقیقت نہ معلوم ہو جائے گی؟ پھر مَیں لوگوں کو جھوٹ اور فریب سے بہکاؤں گا اور اس ذلت کو اپنے حق میں قبول کروں گا۔ اس ذلت و خستگی کے سبب دل و دِماغ میں ایک کشمکش جاری تھی کہ میاں محمد ابراہیم آ گئے، یوں بے کلی کسی قدر کم ہوئی اور کشا کشِ غم سے کچھ نجات ملی۔ وہ مجھے

Scanned by CamScanner

عزیزوں کے حالات، مدرسۂ بندول اور اعظم گڑھ کی کیفیت سے بالتفصیل مطلع کریں گے۔[1]

....

اس دِل کو کبھی راحت نصیب ہوئی، یاد نہیں اور پیسے کا منہ دیکھے بھی تو عرصہ ہوگیا۔ بے مہریِ دنیا کی تاب لاؤں تو کیسے اور گزران ہو تو کیسے؟ اس پر عزیزوں کی باتیں کہ جگر خون ہوتا ہے۔ اگرچہ مَیں کبھی ایسی باتوں کو دِل پر نہیں لیتا، مگر اتنا جانتا ہوں کہ وہ نہ تو کرنے کی ہیں اور نہ سننے کی۔ جب بات ہی جھوٹی ہو تو اس پر کان دھرنے کا فائدہ؟ مگر ایسی باتیں کون برداشت کرسکتا ہے، ع...... عیسیٰ ایں را متحمل شد و مریم برداشت۔ البتہ اس برائی میں سب کو شریک سمجھنا غلط ہے۔ جو مَیں جانتا ہوں، اس کا کہہ دینا گناہ نہیں۔ اگرچہ میری اُن سے نیازمندی ہے۔ اتنا جانتا ہوں کہ...... مجھ سے سرگراں کیوں ہیں۔ مَیں اُن کی ساری باتیں نہیں جانتا اور نہ کبھی میرا یہ رویہ رہا ہے۔[2]

....

آج کل تنہائی سے گھبراتا ہوں، مگر اتنا ہے کہ اس کی بدولت کبھی کبھی کچھ موزوں کرلیتا ہوں، رات بیٹھے بیٹھے ایک غزل لکھ ڈالی۔ نظام [دکن] کا قصیدۂ تہنیت لکھنے کو جی چاہتا ہے، مگر لکھتا نہیں:

پوچھتے کیا ہو کہ کیا لائی ہے ....
کچھ اکیلی نہیں میری قسمت — غم کو بھی ساتھ لگا لائی ہے
آہ کو سُوے اثر بھیجا تھا — واں سے، کیا جانیے، کیا لائی ہے[3]

....

یہ بھی چشمِ فلک کو بُرا نہ لگے کہ عزیزوں میں سے ایک شخص [مولوی محمد سمیع] تو میرے حال سے محبت رکھتا ہے، زندہ باشی و جاوِداں باشی۔[4]

یار کو رغبتِ اغیار نہ ہونے پائے
گلِ تر کو ہوسِ خار نہ ہونے پائے

۱: بنام شیخ عجیب اللہ، ۱۶/۱/۱۸۸۴ء، دوم ۲۶۹
۲: بنام حمید الدین، ۱۷/۱/۱۸۸۴ء، دوم ۲۷۵
۳: بنام محمد سمیع، ۱۸/۱/۱۸۸۴ء، اوّل ۶۲، ۶۳
۴: بنام محمد سمیع، ؟/۲/۱۸۸۴ء، اوّل ۶۷

اس میں در پردہ سمجھتے ہیں وہ اپنا ہی گلہ
شکوۂ چرخ بھی زنہار نہ ہونے پائے

فتنۂ حشر! جو آنا تو دَبے پاؤں ذرا
بختِ خُفتہ مِرا بیدار نہ ہونے پائے

ہائے دل کھول کے کچھ کہہ نہ سکے سوزِ دُروں
آبلے ، ہم سخنِ خار نہ ہونے پائے

چپکے وہ آتے ہیں گُل گشت کو ، اے بادِ صبا!
سبزہ بھی باغ میں بیدار نہ ہونے پائے

پھر کہیں جوش میں آ جائیں نہ یہ دیدۂ تر
سامنے ابرِ گہر بار نہ ہونے پائے

باغ کی سیر کو جاتے تو ہو ، پَر یاد رہے
سبزہ بیگانہ ہے ، دوچار نہ ہونے پائے

جمع کر لیجیے غمزوں کو ، مگر خوبیِ بزم
بس وہیں تک ہے کہ بازار نہ ہونے پائے

آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں ، لیکن شبلی!
حالِ دل ، دیکھیے ، اظہار نہ ہونے پائے[۵]

....

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ کیسے گزر رہی ہے اور شب و روز کیسے کٹتے ہیں تو مَیں حیرت سے اس کا منہ تکتا اور خون کے آنسو روتا ہوں۔ اسحاق نہیں کہ جو اس وحشت میں مجھے بہلائے رکھتا تھا،...... [مولوی حمید الدین] بھی نہیں کہ دل پذیر باتوں سے مردہ جسم میں جان پڑ جاتی تھی۔ آج اگر ابراہیم ہوتا تو مَیں ان حالوں کو نہ پہنچتا۔ مَیں بے ساز و برگ موت کی راہ دیکھتا ہوں۔[۶]

۵: ایضاً، ۷۷-۷۸

۶: بنام حمید الدین، ت ن، دوم ۲۷۶

ہر چند مَیں جانتا ہوں کہ رذیل لوگ بات کا بتنگڑ بناتے ہیں اور اپنی محفلوں میں تمسخر کا سامان کرتے ہیں، تاہم مَیں کہتا ہوں کہ یہ سب اُن کی شیخیاں ہیں۔[7]

....

مَیں نے [استادِ گرامی] حضرت مولوی فاروق صاحب سے عرض کیا تھا کہ میرا فارسی کلام کسی قدر چھاپا جائے گا، اس واسطے اگر آپ اس کو دیکھ لیں تو بہتر ہو۔ حضرتِ موصوف نے منظور فرمالیا ہے۔[8]

ہمارے یہاں غالباً اخیر مئی میں تعطیل ہوگی اور غالباً جولائی کے اخیر تک رہے، وہی میرے آنے کے دِن ہیں۔ اس وقت مَیں معتصم کا حال لکھ رہا ہوں اور [تاریخ بنی العباس کی] پہلی جلد اِن شاءاللہ یہیں تک ختم کردی جائے گی۔[9] ہر روز دو چار سطریں لکھ لیتا ہوں۔[10]

اِن دِنوں دو غزلیں اَور بہ تتبع علی حزیں لکھی گئی ہیں اور دلچسپ ہیں۔[11]

اثر کے پیچھے دلِ حزیں نے سراغ چھوڑا نہ پھر کہیں کا
گئے ہیں نالے جو سُوے گردوں تو اشک نے رُخ کیا زمیں کا

بُری تھی تقدیر یا بھلی تھی ، یہ راز کس طرح سے عیاں ہو
بُتوں کو سجدے کیے ہیں اِتنے کہ مٹ گیا سب لکھا جبیں کا

وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں ، وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں
سیانے ہوں گے تو 'ہاں' بھی ہوگی ، ابھی تو سن ہے 'نہیں ،نہیں' کا

یہ نظم آئیں ، یہ طرزِ بندش ؛ سخن وری ہے ، فسوں گری ہے
کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی! مزہ ہے طرزِ علی حزیں کا[12]

واسوخت فارسی کے پندرہ بند ہیں، یعنی پینتالیس شعر اور اسی قدر نامۂ اردو کے۔

۷: ایضاً، ۲۷۶، ۲۷۷
۸: بنام محمد سمیع، ۲۷/۳/۱۸۸۴ء، اول ۷۲
۹: بنام محمد سمیع، ۹/۴/۱۸۸۴ء، اول ۷۳، ۷۴
۱۰: بنام محمد سمیع، ۲۷/۱۱/۱۸۸۴ء، اول ۷۸
۱۱: بنام محمد سمیع، ۲۴/۴/۱۸۸۴ء، اول ۷۵
۱۲: شبلی بحوالہ جہات، ۱۳

حضرتِ استاد [مولانا محمد فاروق] نے بھی واسوخت کو نہایت پسند کیا۔[13] مجھے خود حیرت ہے کہ مَیں کیونکر اس کو لکھ سکا ہوں، واقعی نہایت پُر درد ہے۔[14] میرا قصد تھا کہ صرف واسوخت اور نامہ سردست چھپ جائے، مگر روپیہ نہیں۔[15]

احباب کو یہ صدا مبارک
یہ مژدۂ جاں فزا مبارک

اس مردمِ چشمِ مردمی نے
یعنی حافظ حسن علی نے

وہ نامۂ لاجواب لکھا
عالم میں نہیں نظیر جس کا

جو مسئلہ ہے، وہ مستند ہے
ہر نقطہ سپندِ چشم بد ہے

تصویرِ یقیں جو ہے تو یہ ہے
شمعِ رہِ دیں جو ہے تو یہ ہے

ہرچند کہ نزدِ صاحبِ فن
ہر حرف ہے اک دلیلِ روشن

پر حق میں عدو کے، اے دل افروز!
ہر سطر ہے ناوکِ جگر دوز

اس 'نامۂ نَو' کا طرز و اسلوب
از بسکہ ہے دل پسند و مرغوب

کچھ ایک عدو نہیں خجل ہے
حاسد بھی حسد سے منفعل ہے

کس طرح سے دیکھ، اے معاند!
باطل ہوئی تیری رائے فاسد

اب سے بھی اگر بجوشِ مستی
ہو تجھ کو خیالِ خود پرستی

میدانِ سخن وسیع تر ہے
دِکھلا، ترے پاس جو ہُنر ہے

اَوروں سے بھی یاوری طلب کر
کر جمع اساتذہ کو یکسر

کیا یاد کرے عدو! یہ تُو بھی
ہاں، کی تھی کسی سے گفتگو بھی

انصار بھی تیرے، وقتِ پیکار
کھولیں نہ کبھی زبانِ گفتار

اکنوں بہ امید دست گیری
ادعوا من حضرۃ القدیری

ان یعصمنی من الدواھی
والامر الیک یا الٰھی![16]

---

[13] بنام محمد سمیع، ۱۸۸۴/۴/۲۴ء، اول ۷۵-۷۶
[14] بنام محمد سمیع، ۱۸۸۴/۳/۲۷ء، اول ۷۲-۷۳
[15] بنام محمد سمیع، ۱۸۸۴/۴/۲۴ء، اول ۷۶
[16] شبلی بحوالہ جہات، ۱۲۶

یہ سچ ہے کہ میرا کوٹھا گرمی [کے موسم میں رہائش] کے قابل نہیں، مگر مَیں عبداللہ خان کے مکان پر رہنا پسند نہیں کرتا۔[17]

....

لکھنا تو درکنار، کمزوری اتنی ہے کہ قلم پکڑنا بھی محال ہے۔ پندرہ دِن ہونے کو آئے، لیکن [ملیریا] بخار ہے کہ ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا۔[18]

ایک بار اسٹریچی ہال میں جلسہ ہوا اور لوگ تنخواہ کے لحاظ سے درجہ بدرجہ آگے پیچھے بٹھائے گئے اور اُس وقت میری کرسی بہت پیچھے رہی تو مَیں نے یہ منظر دیکھ کر گردن جھکالی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔[19]

....

[فروری ۱۸۸۵ء میں] مثنوی [صبح امید] چھپ کر آتی ہے، چار آنہ قیمت عام ہے اور ایک روپیہ قیمت خاص۔[20]

[منتخب اشعار از مثنوی]

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام | جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی | وہ تاج تھی فرقِ آسماں کی
گُل کر دیے تھے چراغ جس نے | قیصر کو دیے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چل کر | ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھویں اُڑا دیے تھے | اٹلی کو کنویں جھنکا دیے تھے

جس چشمہ سے اک جہاں تھا سیراب | وہ سوکھ کے ہو رہا تھا بے آب
پستی نے دبا لیا فلک کو | خورشید ترس گیا چمک کو
اب خضر کو گمرہی کا ڈر ہے | عیسیٰ کو تلاشِ چارہ گر ہے
جو ابر ابھی برس گیا ہے | اک بوند کو اب ترس گیا ہے

۱۷: بنام محمد سمیع، ۱۸۸۴/۴/۲۴ء، اوّل ۷۶
۱۸: بنام محمد سمیع، ۱۸۸۴/۹/۱۶ء، دوم ۲۸۸
۱۹: شبلی بحوالہ حیات، ۵۷۰
۲۰: بنام محمد سمیع، ۱۸۸۵/۲/۵ء، اوّل ۷۸

کس نیند میں سو گئی تھیں آنکھیں
بیکار سی ہو گئی تھیں آنکھیں
بے کار تھا ، بے نظام تھا دل
پہلو میں برائے نام تھا دل

ماتم تھا یہ کہ آئی ناگاہ
اِک سمت سے اِک صدائے جاں کاہ
اس شان سے تھی وہ آہِ دل گیر
پہلو میں اثر ، بغل میں تاثیر
ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں
نشتر سی اُتر گئی جگر میں

صورت سے عیاں جلالِ شاہی
چہرے پر فروغِ صبح گاہی
وہ ریشِ دراز کی سپیدی
چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اِک ذرا خم
توقیر کی صورتِ مجسم

اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی
اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی
اس حال میں بھی روش وہی ہے
دِن ڈھل بھی گیا ، تپش وہی ہے
اس جام میں ہے شراب باقی
اب تک ہے گہر میں آب باقی
گو خوار ہیں ، طرز و خو وہی ہے
مرجھا گئے پھول ، بو وہی ہے[۲۱]

✿

۲۱ کلیاتِ اردو، ۲۰، ۲۱، ۲۴، ۲۵، ۳۵، ۳۶

۱۸۸۶ء

یہاں [علی گڑھ میں] پرسوں [۱۶/فروری] ایک عظیم الشان جلسہ ہے۔ جن طالب العلموں نے ولایت میں کامیابی حاصل کی ہے، اُن کے لیے خیر مقدم ہوگا۔ سید محمود صاحب وغیرہ انگریزی میں اور صرف مَیں اردو میں اسپیچ کے لیے منتخب ہوئے ہیں۔ دعوت بھی ہوگی، مَیں شاید کوئی نظم اس وقت پڑھوں۔ آج کل دماغ کے ضعف کی سخت شکایت ہے۔[1]

یوں تو مدرسۃ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں، مگر اِن دنوں [۲/مارچ] ہوا کا رُخ ہی بدل گیا ہے۔ لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے، جس کو وہ لجنۃ الصلوٰۃ کہتے ہیں۔ ایک بی اے سکرٹری ہے اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں۔ چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خواں لوگوں کو اس پُر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے، الصّلوۃ خیر من النّوم۔ پانچوں وقت کی نمازیں بجماعت ہوتی ہیں اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش سے، بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں۔ مغرب کی نماز، سبحان اللہ! کیا شان وشوکت ہوتی ہے کہ بس دل پھٹا پڑتا ہے۔ خود سید صاحب بھی شریکِ نماز ہوتے ہیں اور چونکہ وہ عامل بالحدیث ہیں، 'آمین' زور سے کہتے ہیں۔ ان کی 'آمین' کی گونج مذہبی جوش کی رَگ میں خون بڑھا دیتی ہے۔ مَیں کبھی کبھی اسلام پر لیکچر دیتا ہوں۔ مسجد بننے کی تیاری ہے، سید محمود صاحب کی سرگرمی نے اس کے پیمانہ تعمیر کو نہایت وسیع کر دیا ہے۔ وہ مہتمم خاص ہیں اور تین ہزار چندہ خود دیں گے، مَیں نے بھی پچاس روپے دیے ہیں۔ مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس

۱: بنام محمد سمیع، ۱۴/۲/۱۸۸۶ء، اوّل ۸۳

جوشِ مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا۔ اس جوشِ مسرت میں اَور بھی لکھتا، مگر مجھ کو میرے بھائی، خصوصاً میاں اسحاق و عثمان یاد آ گئے اور میرا سارا جوش اس طرح ٹھنڈا ہو گیا، جس طرح طاؤس کا اپنے پاؤں دیکھنے سے۔ ان عزیزوں نے ترقی و لیاقت کا طرۂ فخر صرف لامذہبی کو سمجھا ہے، حالانکہ [ان کی] لیاقت بھی کچھ دنیا سے نرالی نہیں۔[2]

یہاں اِن دِنوں خوب جلسے ہو گئے۔ بیرسٹروں کے لیے خیر مقدم ہوئے۔ میاں عبدالمجید جونپوری بھی تھے۔ مجھ سے بہت انس پیدا کیا۔ اصرار کرتے گئے کہ الٰہ آباد میں ان کے ہاں ٹھہروں اور ان کو پہلے سے مطلع کروں۔ کل مولوی عبدالغفور و شاہ امجد اللہ بھی یہاں پہنچے۔ امجد اللہ کی خر دِماغی پر سخت حیرت ہوئی۔ ان سبھوں کو منصفی اس سے زیادہ مغرور کرتی ہے، جتنا کہ فرعون کو مصر۔ مولوی عبدالغفور نہایت لطف سے ملے۔ خیر، ان حضرات سے کیا مطلب؟ ہاں، ایک لطیفہ، مولوی عبدالغفور نے مجھ سے کہا کہ سنا ہے کہ مہدی نہایت آزادانہ بے تمیزی کے خط اپنے والد قبلہ کو لکھتے ہیں۔ اور اس خط کا حوالہ دیا، جس میں انھوں [مہدی] نے لیڈیوں کے ناچ کا ذکر کیا تھا۔ مجھ کو یہ تعجب ہوا کہ یہ خبریں ان لوگوں کو کیونکر پہنچتی ہیں۔ والد قبلہ، جو مہدی کے خطوط ان سبھوں کو سناتے ہیں تو سب اسی نکتہ چینی کی غرض سے سنتے ہیں۔ خیر، لٹ دی ڈاگ بارک [Let the dog bark]۔[3]

مَیں اِن شاءاللہ ۲۶ / مارچ کو یہاں [علی گڑھ سے] روانہ ہوں گا اور الٰہ آباد ٹھہرتا ہوا اعظم گڑھ پہنچوں گا۔ اب کی مَیں نے اسی وجہ سے ایک مدید تعطیل حاصل کی ہے کہ جم کر اپنا علاج کروں۔[4] اب کی [موسمِ گرما کی] تعطیل تین مہینے پندرہ دن کی ہے، مگر یہ میرے لیے خاص ہے، ورنہ کالج کی اصلی تعطیل ڈھائی مہینے کی ہے۔[5]

ان دِنوں یہاں مدبر الملک وزیر الدولہ خلیفہ سید محمد حسن صاحب وزیر ریاست پٹیالہ تشریف لائے ہیں۔ ان کے لیے کالج میں خوب جلسے ہوئے۔ مجھ سے نہایت شوق سے

۲: بنام مولوی حکیم محمد عمر، ۲/۳/۱۸۸۶ء، اوّل ۴۹-۵۰　۳: بنام محمد سمیع، ۶/۳/۱۸۸۶ء، اوّل ۱۰۰-۱۰۱

۴: بنام محمد سمیع، ۱۶/۳/۱۸۸۶ء، اوّل ۸۴　۵: ایضاً، ۸۴-۸۵

ملے، وہ مجھ کو پہلے سے جانتے تھے۔ جلسہ دعوت میں سید محمود کی فرمائش سے میں نے چند بند فارسی میں پڑھے۔ عجیب سماں بندھ گیا تھا۔ تمام حضارِ مجلس حقیقت میں بے تاب ہو گئے۔ سید محمود صاحب اٹھ اٹھ کر ہر بند کو کئی بار پڑھواتے تھے۔ وزیر صاحب نے بڑھ کر کہا کہ افسوس ہے کہ ان شعروں میں آپ نے میرا ذکر کیا ہے، ورنہ میں اس کی پوری داد دیتا۔[۶]

[ابتدائی بند]:

اے دل ایں مایہ انتظار کہ بود؟
آخر ایں سستی از خمار کہ بود؟
چشم شوقت برہگذار کہ بود؟
ہوسِ سرمۂ غبار کہ بود؟

ایں بہ بیں خانہ جلوہ گاہ کہ ہست؟
پردۂ دیدہ فرشِ راہ کہ ہست؟[۷]

مثنوی ہنوز چھپ کر نہیں آئی۔ افسوس ہے کہ میں اتنی مدت میں کچھ کام نہ کر سکا۔ مولوی حالی صاحب نے مسدس [مد و جزرِ اسلام] پر جو اضافہ کیا ہے، مجھے بھیجا ہے۔[۸]

....

[مجھ سے عربی] پڑھنے [اور مجھے فرنچ] پڑھانے کا جو وقت انھوں [پروفیسر آرنلڈ] نے مقرر کیا تھا، اس میں ایک منٹ کا فرق کبھی نہیں پڑتا تھا۔ ایک دفعہ چند منٹ کی دیر ہو گئی تو اتنی معذرت کی کہ مجھے شرمندگی معلوم ہوئی اور کہنے لگے کہ یورپ میں وقت کی بڑی قیمت ہے۔ آرنلڈ صاحب نے انگریزی میں لکھی ہوئی کوئی عربی گرامر لے کر چپکے چپکے از خود عربی صرف ونحو کے مسئلے پڑھنے شروع کیے، چند روز کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ دیکھیے، میں عربی عبارت پڑھتا ہوں، کہیں غلطی تو نہیں ہوتی۔ اس کے بعد عبارت پڑھی، ایسی صاف اور صحیح پڑھی کہ حیرت ہو گئی۔[۹]

۶: ایضاً
۷: حاشیہ (۱)، اوّل ۸۴
۸: بنام محمد سمیع، ۱۸۸۶/۳/۱۶ء، اوّل ۸۴
۹: شبلی بحوالہ حیات، ۱۳۷

ایک مرتبہ کوئی یورپین فاضل علی گڑھ آکر مجھ سے ملا۔ اس کا فارسی کا ذوق تھا، اس سے اس موضوع پر باتیں ہوئیں تو اس کی واقفیت بہت محدود معلوم ہوئی۔ دو سال کے بعد اس نے فارسی ادب پر کوئی کتاب لکھ کر میرے پاس بھیجی، جو بہت غنیمت تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا، مَیں نے اپنے اس تعجب کا ذکر پروفیسر آرنلڈ سے کیا۔ انھوں نے پوچھا کہ 'آپ اُن سے کب ملے تھے'؟ 'دو سال ہوئے'۔ فرمایا، 'مولانا! یورپ کا آدمی دو سال میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے'۔

[ایک دفعہ] مَیں نے آرنلڈ صاحب سے کہا کہ ہم لوگ اپنے استادوں کی جیسی عزت کرتے ہیں، وہ آپ لوگ نہیں کرتے۔ آرنلڈ صاحب نے کہا، 'بات یہ ہے، ہمارے ہاں علم ہر روز آگے بڑھ رہا ہے، اس لیے ہر شاگرد اپنے استاد سے کچھ زیادہ ہی جانتا ہے، اس لیے وہ اس کی رسمی عزت کہاں تک کرے'۔[10]

....

سب [اعظم گڑھ والوں] نے خط لکھنے کی قسم کھالی ہے یا کسی منت پر روزۂ سکوت رکھا ہے؟ مولوی عمر صاحب الگ دم بخود ہیں، [مولوی محمد سمیع] جدا خاموش، مہدی نے اعظم گڑھ پہنچنے کی رسید تک نہیں لکھی، والد قبلہ کو کام سے کہاں فرصت! اس مہنگی [مہنگائی؟] میں بھائی مولوی محمد سعید صاحب کی دو سطریں اگرچہ صرف مطلب کی ہے، غنیمت معلوم ہوئیں۔ کیا سنسان کا عالم ہے، گویا اِن تلوں میں تیل ہی نہ تھا۔ خیر، شکایت کیوں کیجیے، دوسرے پر زور کیا، جب گھر بار چُھوٹے، عزیز آشنا چُھوٹے تو غربت میں کوئی کیوں کسی کا ساتھ دے۔ لو، صبر آ گیا۔[11]

[جون کے] روزے بڑی مشکل سے کٹتے ہیں، مَیں تو آدھا رہ گیا ہوں۔ خط لکھنا بھی دُشوار ہوتا ہے۔[12]

....

۱۰: ایضاً، ۱۳۸-۱۳۹

۱۱: بنام محمد سمیع، ۱۸۸۶/۳/۲۵ء، اوّل ۷۹-۸۰

۱۲: بنام سر سید، ۱۸۸۶/۶/۱۲ء، مکتوبات ۲۱

ایک بہاریہ قصیدہ لکھنا شروع کیا تھا، اگرچہ ابھی صرف ۲۷ شعر ہوئے، مگر اُمید ہے کہ اُمید سے بڑھ کر ہوئے، غالباً غالب سے کم رُتبے کا نہ ہو[۱۳]

دوش ایں مژدہ بگوش گل و ریحاں آمد
کہ بہار آمد و بسیار بساماں آمد

ابر گوہر ہمہ افشاند چو گریاں بگذشت
گل ہمہ زر پراگند چو خنداں آمد

آب را سلسلہ بر پاے بہ بستند ز موج
بسکہ دیوانہ وش از طرف بیاباں آمد

لالہ چوں مغ بچگاں چہرہ برافروخت بباغ
سنبل آشفتہ تر از طرۂ خوباں آمد

سبزہ سر برزدہ از خواب دگر رفت بخواب
بسکہ باد سحرش مروحہ جنباں آمد

ہر حبابے کہ سر از آب برآرد گوید
باید از سر بتماشاے گلستاں آمد

عیدِ نَو روز بہارست کہ در خدمتِ گل
سرو و عرعر بمیاں برزدہ داماں آمد

می دمد گہ بچمن گاہ خرامد لب جوے
بادِ صبح آمد و بر شیوۂ مستاں آمد

بوے گل ہست کہ بر دوش صبا تکیہ زدہ است
من غلط کردم و گفتم کہ سلیماں آمد

۱۳: بنام محمد سمیع، ۱۶/۶/۱۸۸۶ء، اوّل ۸۸

آتش افروخت گل و مرغ چمن گشت خلیل
که برو آتش سوزندہ گلستاں آمد
زیں دو سہ حرف فزوں نیست مغاں را سخنے
کہ بہار آمد و ابر آمد و باراں آمد
دور دورِ گل و مل ہست کہ در جوشِ طرب
زاہد از صومعہ در میکدہ مہماں آمد
بزم آرائے و گل افشاں و قدح گیر کہ باز
آمد آں شوخ و چگویم بچہ ساماں آمد
رخ برافروختہ و طرّہ فروہشتہ بدوش
جام در دست و گلی و لالہ بداماں آمد
طرّۂ پُر شکنش بسکہ بہ پیچید بہ پاے
ہم بہر گام چو مست افتاں و خیزاں آمد
چوں بیکبارہ نقاب از رُخِ زیبا برداشت
تا چگویم کہ چہا برسرِ ایماں آمد
او ہماں یک نگہِ ناز زیاں کرد و مرا
روزگارِ خرد و ہوش بپایاں آمد
جامِ مے داد بدستِ من و آنگہ بسرود
غزلے تازہ کہ آرائشِ دیواں آمد
بر من ایں مایہ بلا از لبِ جاناں آمد
چکنم آہ بدردے کہ ز درماں آمد[۱۴]

....

میں نہایت مستعدی سے علاج کر رہا ہوں، تبخیر کی شکایت ہے۔[۱۵]

۱۴: کلیاتِ فارسی، ۲۱۰-۲۲
۱۵: بنام شیخ عجیب اللہ، ۱۸۸۶/۸/۱۲ء، اوّل ۱۸

جرمنی میں اب کی سال ایک عظیم الشان مجلس منعقد ہوگی، جو صرف عربی فارسی وغیرہ پر تحقیقاتِ جدیدہ کے دفتر پیش کرے گی۔ حمید اللہ خاں کو گورنمنٹ انگریزی نے وہاں سفیر کر کے بھیجنا چاہا ہے۔ ان کا خط آیا ہے کہ مجھ کو بھی مجلس مذکور میں کوئی مضمون پڑھنا چاہیے۔ حمید اللہ خاں نے یہ اعتراف کر کے کہ وہ اس کام کو بالکل انجام نہیں دے سکتے، سید احمد خاں صاحب کو لکھا ہے کہ وہاں کے علما سے کچھ لکھوا کر ارسال فرمایئے؛ بالخصوص میرا نام لکھا ہے۔ یہ مضمون وہ اپنے نام سے نہیں پڑھیں گے، بلکہ جس کا لکھا ہوگا، اُسی کے نام سے۔ افسوس ہے کہ میری طبیعت صحیح نہیں، فرصت بھی کم رہ گئی ہے، شاید نہ لکھ سکوں[16]

....

مجھ کو بخارِ خفیف رہتا ہے، مولوی سید محمد صاحب کا علاج ہوتا رہا، مگر کچھ مفید نہ ہوا۔ پرسوں [۲۷/اگست] دہلی جاتا ہوں، سید حامد صاحب خلف سید احمد خاں صاحب وہیں ہیں، انھوں نے بھی میرے آنے کی تحریک کی ہے اور امید ہے کہ اطبا توجہ کریں۔ گرمیوں میں سید صاحب نینی تال جائیں گے، مَیں بھی اُن کے ساتھ جانے کا قصد رکھتا ہوں۔ بخار تو آج کل یہاں اس قدر عام ہے کہ ایک فرد بشر نہیں بچا ہے اور ہر شخص آئے دِن بیمار ہو جایا کرتا ہے[17]۔

....

مَیں اب [۱۷/اکتوبر] تک بیمار ہوں، شدت کا بخار ہر روز رہتا ہے[18]۔ کوئی ظاہری بیماری نہیں، مگر طبیعت میں وہی افسردگی ہے[19]۔

....

مدرسے کے حالات بہت کم معلوم ہوتے ہیں؛ دیکھیے، اب [۲۷/نومبر] کی انسپکٹر کا ملاحظہ کیسا ہوتا ہے؟ جاڑوں کی تعطیل میں مڈل کلاس کو اعظم گڑھ رہ کر کوئی انتظام تعلیم کا کرنا

۱۶: ایضاً

۱۷: بنام شیخ عجیب اللہ، ۱۸۸۶/۸/۲۵ء، اوّل ۲۰، ۲۱

۱۸: بنام شیخ عجیب اللہ، ۱۸۸۶/۱۰/۱۷ء، نام ۱۳

۱۹: بنام محمد سمیع اللہ، ۱۹/۱۱/س ن، اوّل ۹۹

چاہیے۔اعزہ [یہاں علی گڑھ میں] اچھے ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ گھبراتے نہیں، اگرچہ گھر چلنے کے دِن گنتے رہتے ہیں۔ سید صاحب فرماتے ہیں کہ انگریزی بھی شروع کرادی جائے، مگر مَیں ابھی مناسب خیال نہیں کرتا ہوں۔ نثار کالج سے آ گئے ہیں؛ معلوم نہیں، بھائی مجید کہاں گئے۔ افسوس ہے کہ عزیزی اسحاق اس تعطیل میں مکان پر نہ ہوں گے۔ مَیں نے عیدیہ قصیدہ میں آج کل ایک تقریب سے کچھ تغیر کیا ہے۔ کوئی چھبیس شعر بڑھا دیے ہیں، مگر اتنے ہی اصل میں سے نکال بھی دیے۔ واقعی یہ شعر، جو بڑھائے گئے، بلند پایہ ہیں۔[20]

اب کی [موسمِ سرما کی] تعطیل میں [اعظم گڑھ] نہ آ سکوں گا، نیشنل کانگریس کا جلسہ ہے اور ۲۸ [دسمبر] تک ضرور ہی یہاں [علی گڑھ] میں رہنا ہے۔[21]

۲۰: بنام محمد سمیع، ۱۸۸۶/۱۱/۲۷ء، اوّل ۱۰۲

۲۱: بنام محمد سمیع، ۱۸۸۶/۱۲/۱۴ء، اوّل ۸۵

۱۸۸۷ء-۱۸۸۹ء

مجھ کو نینی تال میں کچھ دلچسپی نہیں ہے، بس اتنا ہے کہ روزے [مئی ۱۸۸۷ء] یہاں گرمی نہیں کرتے۔[1] [نینی تال تک جانے کے لیے] کارٹ گودام تک ریل ختم ہوتی ہے اور پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ کارٹ گودام سے نینی تال ۱۲ میل ہے، مگر تمام راستہ قدرتِ الٰہی کی نیرنگی وعظمت کا مرقع ہے۔ عرض میں پانچ چھ ہاتھ زمین چھوٹی ہوئی ہے، جس پر رستہ چلتا ہے۔ باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہے، جس کی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے؛ دوسری جانب نہایت عمیق ہولناک غاروں کا سلسلہ ہے اور اگر اس پہاڑ میں سخت سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دارالسلطنت ہوتے۔ نینی تال جب تین میل رہ جاتا ہے تو پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ سطحِ زمین سے اس مقام کا ارتفاع تین میل سے کم نہیں، مگر اس کج و پیچ سے راہ نکالی ہے کہ بے اختیار انگریزوں کی ہمت پر آفریں کی صدا بلند ہوتی ہے۔ جو کوٹھا تین میل کا اونچا ہو گا، اس کے زینے کیسے پُر پیچ اور دُشوار گزار ہوں گے۔ کوئی شخص کیسا ہی بے حس یا مستقل دل رکھتا ہوں، یہاں پہنچ کر ممکن نہیں کہ حیرت کے صدمے سے بچ سکے۔ تال، جو ایک میل سے زیادہ لمبا ہے، یہ ایک نہایت گہرا غار تھا، جس کی تھاہ اب بھی غیر معلوم ہے۔ اس میں مدت سے قدرتی چشموں کا پانی گرتا ہے اور اب وہ بھر گیا ہے اور تال کے لقب سے ممتاز ہے۔ شام کو اس کے کنارے میموں اور مسوں کا مجمع ہوتا ہے اور وہ مختلف طرح کے کھیل کھیلتی ہیں۔ سامنے ایک میدان ہے، جس میں انگریز کرکٹ کھیلتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے، مگر چونکہ

۱: بنام محمد سمیع، ۱۸۸۷/۵/۸ء، اوّل ۸۶

اس کے دونوں طرف پہاڑ کی نہایت اونچی دیواریں کھڑی ہیں، مجھ کو یہ جگہ ہر طرف سے نہایت بند اور گھٹی ہوئی معلوم ہوئی۔ مجھ کو یقین ہے کہ جو شخص صحرائیت اور فضائیت کا دلدادہ ہے، میرے دعوے کی شہادت پر فوراً آمادہ ہوگا۔ جس کوٹھی میں مَیں ہوں، بہت بلندی پر نہیں ہے، تاہم دو دِن کی مشق میں نیچے تک پہنچنے اور واپس آنے میں میرا دم ٹوٹ جاتا ہے اور کئی جگہ ٹھہرنا پڑتا ہے۔ ہر ایک کوٹھی سے انگریزوں کی بے روک ہمت اور پُر جوش محنت کی شہادت ملتی ہے۔ یہاں جو کچھ آرام ہے، صرف یہ ہے کہ کسی وقت یہاں آفتاب کی عمل داری نہیں ہونے پاتی؛ یہی بات ہے، جس کے لیے انگریزوں نے لاکھوں کروڑوں روپے صرف کر دیے ہیں۔ درحقیقت ہم کو انگریزوں سے سبق سیکھنا چاہیے کہ صحت سب چیزوں پر مقدم ہے اور کوئی کام دنیا میں ناممکن نہیں۔ رمضان تو خوب گزرے گا۔ مجھ کو اگر کچھ دلچسپی ہے تو اسی سے۔ جس کوٹھی میں ہوں، سید صاحب کے حقیقی بھتیجے بھی مع اہل و عیال کے تشریف فرما ہیں۔[۲]

....

[۱۸۸۷ء میں استادِ گرامی مولانا فیض الحسن وفات پا گئے تو آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔[۳]]:

دریں آشوب غم عذرم بنہ گر نالہ زن گریم
جہانے را جگر خوں شد ہمیں تنہا نہ من گریم

بہ تحسین صبوری چند بفریبی مرا ناصح
دمے بگذار تا در ماتمِ فیض الحسن گریم

بہ مرگش، علم و فن در نالہ با من ہم نوا باشد
ہنر بر خویشتن گرید چو من بی خویشتن گریم

دوتا غم دارم و ہر یک ز دیگر حسرت افزا تر
بہ مرگش گریم و آنگاہ بر مرگِ سخن گریم

۲: بنام شیخ حبیب اللہ، ۲۵/۵/۱۸۸۷ء، اوّل ۱۰-۱۱   ۳: ماخوذ از حیات، ۹۸-۹۹

خود ایں آشوب و ایں ہنگامہ از یادم نخواہد شد
ہماں نو باشد ایں غم تا دریں دیرِ کہن گریم
گہے بے خود بہ برہم گشتنِ کارِ ہنر نالم
گہے بے خویش بر روزِ سیاہِ علم و فن گریم
بہ یکبار انجمن برہم زدی تا از میاں رفتی
سزد من گر دریں ماتم چو شمع انجمن گریم
چہ در دل داشتی تا از کہ رنجیدی چرا رفتی
زما بگستہ ای مولاے ما آخرِ کجا رفتی
نہ گویم من تو خود انصاف دہ تا از کہ مے آید
عرب را زندہ کردن وانگہ از ہندوستاں بودن
بہ ہنجار دری بر جادۂ پیشینیاں رفتن
بہ آہنگِ حجازی یادگارِ پاستاں بودن[۴]

....

میری بیاض کا قریباً آدھا حصہ چوری ہو گیا، نہایت افسوس ہے۔[۵]

[محمڈن ایجوکیشن] کانگریس بے مثل اور توقع سے زیادہ کامیاب ہوئی۔ میرا مضمون علیحدہ چھپ رہا ہے، چھ جز کی ضخامت ہو گی۔ قصیدہ، اس مضمون اور [کانگریس کی] رُوداد، دونوں کے ساتھ چھپے گا۔[۶]

....

یہ [نیشنل] اسکول [اعظم گڑھ] ہم [خاندان کے] لوگوں کے خیالات اور حوصلوں کا ایک عمدہ مشغلہ ہے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کی عملی ترقی کے ساتھ اس کو بھی ترقی دیتے جائیں گے۔ آخر وہ کیا چیز ہے، جس کو محسوس صورت میں ہم ایک قومی کام کہہ سکتے

۴: کلیات فارسی، ۳۸-۳۹
۵: بنام محمد سمیع، ۲۷/۷/۱۸۸۷ء، اوّل ۸۹
۶: بنام محمد اسحاق، ۱۴/۱/۱۸۸۸ء، اوّل ۲۵

ہیں۔ ہم میں جو لوگ قومی مذاق پیدا کرتے جائیں گے، ان کے لیے اپنی قومی فیاضی کے صَرف کرنے کا اس اسکول سے عمدہ تر کیا موقع ہوگا۔ سرِ دست میرے نزدیک بھی وہ ایک حقیر صورت رکھتا ہے، لیکن ایک لوہار کی اس میلی چمڑی سے کم حیثیت نہیں ہے، جس کو اس نے مدت تک اپنے پاؤں کے محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کیا تھا اور جو بعد کو ایک معمولی علم پر چڑھ کر تین ہزار برس تک درفش کاویانی کے فخر آمیز لقب سے پکارا گیا۔[7]

....

لائف آف ابوحنیفہ کا پہلا حصہ مَیں ختم کر چکا، اب [دسمبر میں] دوسرا حصہ شروع کروں گا۔[8]

مَیں اِن شاء اللہ مئی ۱۸۹۱ء میں ضرور قسطنطنیہ روانہ ہو جاؤں گا اور غالباً چھ مہینے وہاں قیام کروں گا۔[9]

۷: بنام محمد اسحاق، ۱۴/۱/۱۸۸۸ء، اوّل ۲۶-۲۷ ۸: بنام محمد سمیع، ۱۱/۱۲/۱۸۸۹ء، اوّل ۹۰

۹: ایضاً

۱۸۹۰ء

میری تصنیفات سے المامون و الجزیہ سید صاحب نے کالج کے لیے چھاپی ہیں۔ مجھ کو حق تصنیف میں صرف ایک [ایک] نسخہ عنایت ہوا تھا۔ 'گذشتہ تعلیم' کی کوئی جلد باقی نہیں رہی، 'پیامِ یار' اس کو دوبارہ چھاپ رہا ہے۔ اس وقت [یعنی ۸/مئی] تک مَیں نے اپنی کسی تصنیف کو نہ خود چھاپا، نہ اس سے فائدہ اٹھایا۔[۱]

امام ابوحنیفہؒ کی سوانح عمری [سیرت النعمان] کا پہلا حصہ، جو قریباً ایک سو چالیس صفحوں میں ہے، ختم ہو گیا؛ دوسرے حصے میں صرف ان کے علوم و ترتیبِ فقہ و طریقہ اجتہاد کی تفصیل ہوگی، اخیر میں ان کے مشہور شاگردوں کا مختصر تذکرہ ہوگا، لیکن امید ہے کہ دوسرا حصہ پہلے سے ضخامت میں زیادہ ہوگا اور حقیقت میں میری محنتوں کا وہی تماشا گاہ ہوگا۔ اس کتاب کی تصنیف میں گو بڑی خاک چھاننی پڑی، بہت سے کتب خانے دیکھنے پڑے، تاہم اگر کتاب مرضی کے موافق تیار ہو گئی تو ایک نادِر چیز ہوگی اور تمام محنت اور کاوِش کا معاوضہ ہو جائے گا۔[۲]

....

مریضہ [یعنی میری اہلیہ] کا حال بدستور ہے۔ افسوس ہے کہ جناب جدامجد [دادا جان: حسن علی] نے بیاسی برس کی عمر میں، تین چار دِن ہوئے، [۲۷، ۲۸/مئی کو] انتقال کیا۔ اگرچہ ان کی عمر پوری ہو چکی تھی، لیکن چونکہ ان کی موت ناگہانی طور پر ایک صدمے سے ہوئی، اس لیے لوگوں کو نہایت رنج ہوا۔ ان کے تمام قویٰ درست تھے، مَیں نے رسالہ حسن ان کو دیا تھا تو بغیر عینک کے پڑھ گئے، خدا مغفرت کرے۔ مَیں اعظم گڑھ نہیں گیا،

۱: بنام مہدی افادی، ۸/۵/۱۸۹۰ء، دوم ۲۲۳ ۲: بنام مولوی حکیم محمد عمر، ۲۷/۱۱/۱۸۹۰ء، اوّل ۵۰-۵۱

نہ قصد ہے؛ لیکن چونکہ اس حادثے کی وجہ سے والد قبلہ خود آئے تھے، سامنا ہو گیا۔ مَیں جلد تر یہاں سے روانہ ہوں گا۔ شاید سر دست لکھنؤ جاؤں۔[۳]

....

آج کل کالج کے کام نے مجھ کو تصنیف سے بالکل معذور کر دیا ہے، مگر یہ عارضی حالت ہے۔ صرف شروع سال میں کام بڑھ جاتا ہے، امید ہے کہ نصف اگست سے پورا موقع حاصل ہو۔[۴]

ایک ہفتے سے بخار میں مبتلا ہوں، جیسی گزرتی ہے، خدا جانتا ہے۔ ضعف سے لکھنے کا یارا کہاں![۵]

بندول کے مدرسہ فارسی کی نسبت ایک خوابِ پریشاں دیکھا ہے، تنخواہ آئے تو سب چندے بھیجتا ہوں۔[۶]

۳: بنام سر سید، ۱/۶/۱۸۹۰ء، مکتوبات ۲۱
۴: بنام مہدی افادی، ۸/۷/۱۸۹۰ء، دوم ۲۲۵
۵: بنام محمد سمیع، ۸/۹/۱۸۹۰ء، اوّل ۹۱-۹۲
۶: ایضاً

۱۸۹۱ء

[نیشنل] اسکول کے لیے...... چندہ...... مَیں بھیج دوں گا، البتہ لوگوں سے دِلانا مشکل ہے۔ ماموں عبدالحق کا نام تو برائے بیت ہے، میاں احمد علی کا یہ حال ہے کہ سید صاحب کی فرمائش سے سرکے کی بوتلیں مانگی تھیں، تین مہینے ہو چکے، ان کا جواب یہ ہے کہ ابھی تیار نہیں؛ حافظ حبیب اللہ کی مالی حالت اچھی ہو گی تو دریغ نہ کریں گے، لیکن حافظ حسن علی صاحب...... زرمی طلبد سخن دریں است۔ مکانِ مدرسہ اپنا مکان ہے، اس لیے اس پر پبلک کا روپیہ لگایا جائے اور آئندہ مدرسہ کہیں اُور اُٹھ جائے تو لوگوں کو کہنے کا موقع ہو گا کہ عام چندے سے اپنا مکان بنوایا گیا۔ اعظم گڑھ میں ایسے ہی بدگمانوں کی زیادہ آبادی ہے، سب سے مقدم بورڈنگ ہے[1]

....

[الٰہ آباد میں محمڈن ایجوکیشن کانفرنس کے] اس [پانچویں] جلسے کی یہ رائے ہے کہ اس مضمون [مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم] پر ایک رسالہ لکھوایا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے عہدِ عروج میں جو علم یونان ومصر و ہندوستان و فارس سے حاصل کیے تھے، اُن پر کون سے مسائل اور علوم اضافہ کیے۔ اس رسالے میں ہر ایک اَمر اور مسائل و مباحث کو بالتفصیل بحوالۂ اسناد ثابت کیا جائے[2]۔ اگر زمانے نے مساعدت کی تو ان تمام باتوں کو تفصیل اور اس طرح پر، جس سے صاف ظاہر ہو جائے کہ مسلمانوں کو جب یہ علوم ملے تو کیا تھے اور ان کی کوششوں نے ہر ایک علم کو کس قدر آگے بڑھایا، ایک مستقل رسالے میں لکھوں گا[3]

۱: بنام محمد اسحاق، ۶/۷/۱۸۹۱ء، اوّل ۲۷ ۲: شبلی بحوالہ حیات، ۱۵۴

۳: ایضاً، ۱۵۵

افسوس کی بات ہے کہ پارسال [محمڈن ایجوکیشن کانفرنس کے اجلاس میں] جو رزولیوشن پاس ہوئے، ان کے متعلق عملی کارروائیاں بہت کم ہوئیں۔ نہ اسکالرشپ فنڈ میں کوئی معقول اضافہ ہوا، نہ اعلیٰ تعلیم اور ادنیٰ تعلیم کے موازنے پر مضامین لکھے گئے؛ تاہم مَیں سیکرٹری صاحب [سرسید] کے ان الفاظ سے کہ ہماری [ایجوکیشنل] کانفرنس بے فائدہ چیز ہے اور مفت میں ہزاروں روپے برباد کرتی ہے، ہرگز اتفاق نہیں کرسکتا؛ بلکہ اگر سیکرٹری صاحب معاف فرمائیں تو مَیں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی یہ راے غلط اور بالکل غلط ہے۔[۴]

۱۱ردسمبر کو یہاں [علی گڑھ] میں نہایت عمدہ جلسہ اور سیریں ہوں گی اور ۱۹ردسمبر تک کالج ایک تماشا گاہ بنا رہے گا۔ پھر بیچ میں وقفہ ہوکر ۲۷ردسمبر سے کانفرنس شروع ہوگی۔[۵] اب کی کانفرنس میں مجمع تو بہت نہ ہوگا، لیکن بڑے بڑے لائق جمع ہوں گے اور اپنا جوہرِ کمال دِکھائیں گے۔[۶]

....

المامون کے بعد مَیں نے الفاروق لکھنی شروع کردی تھی اور ایک معتد بہ حصہ لکھ بھی لیا تھا، لیکن بعض مجبوریوں سے چندروز کے لیے اُس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا؛ اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں، حالانکہ بات اتنی تھی کہ بعض نادِر کتابیں، جو اس تصنیف کے لیے ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں، ابھی تک پوری چھپ کر نہیں آ چکیں۔ اس زمانۂ انتظار میں بے کار بیٹھنا تو مشکل تھا، خیال ہوا کہ کسی اَور نامور کی لائف شروع کروں، لیکن یہ دیکھ کر کہ الفاروق ناتمام ہے، طبیعت رُک جاتی تھی اور اس میدان میں ایک قدم آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔ اِدھر یہ خلش چین نہ لینے دیتی تھی کہ علمی نام آوروں کے کارنامے دِکھانے بھی ضرور ہیں، کیونکہ اسلام میں تیغ و قلم کا ہمیشہ ساتھ رہا تھا۔ آخر یہ خیال غالب آیا اور چندروز کے لیے خاندانِ حکومت کو چھوڑ کر علمی سلسلے کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ فقہ، حدیث، ادب، منطق، فلسفہ، ریاضی مختلف خاندان سامنے تھے۔ بعض

۴: خطبات، ۱۷
۵: بنام شیخ حبیب اللہ، ۱۸۹۱/۱۲/۷ء، اوّل ۲۱-۲۲
۶: بنام محمد سمیع، ۱۸۹۱/۱۲/۱۲ء، اوّل ۹۳

وجوہ سے فقہ کو ترجیح دی اور امام ابوحنیفہؒ کو، جو فقہ کے بانی ہیں، اس کا ہیرو قرار دیا۔ عربی، فارسی، ترکی، بلکہ یورپ کی زبانوں میں ان کی متعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں؛ ظلم تھا، اگر ان کے حالاتِ زندگی اردو میں نہ لکھے جاتے، جو بلحاظِ غالب انھی کے پیرووں کی زبان ہے۔[۷]

سیرت النعمان یعنی لائف آف ابوحنیفہ بالکل تیار ہے، اخیر دسمبر میں اِن شاءاللہ مطبع سے شائع ہوگی۔ تین سو صفحوں کی کتاب ہے، ایک روپیہ چار آنے قیمت قرار پائی ہے۔ گو محنت اور جانکاہی بہت ہوئی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ کتاب بھی اچھی تیار ہوئی۔[۸]

اعظم گڑھ اور دیہات و اطراف میں اس کتاب [سیرت النعمان] کے بہت سے نسخے شائع ہونے چاہییں، حنفیوں کو مزید اطلاع کا باعث ہوگا۔ چند اشتہارات بھی بھیج دیے ہیں، کچہری کے عمال اور سوداگروں کو اس سے واقف ہونا چاہیے۔[۹]

۷: نعمان، ۶-۷ ۸: بنام محمد سمیع، ۱۲/۱۲/۱۸۹۱ء، اوّل ۹۲

۹: بنام محمد سمیع، ۱۳/۱/۱۸۹۲ء، اوّل ۹۳ (اگرچہ یہ مراسلہ ۱۸۹۲ء کا ہے، لیکن اس کے اندراج کا محل یہیں ہے)

۱۸۹۲ء

مَیں تین چار مہینے سے اکثر صحیح نہیں رہتا۔ آج پانچواں دن ہے کہ بہت سخت بخار آیا، ایک سو چھ درجے پر حرارت تھی۔ چار دن تک یکساں حالت رہی اور نہایت سخت تکلیف رہی۔ کل سے کمی ہے، لیکن تکلیفیں وہی ہیں، کھانسی بہت ہے۔ کونین، جو بہت سی کھلا دی ہے تو کان سے بہت اونچا سننے لگا ہوں[1]۔ بخار کے دَورے ہوتے جاتے ہیں۔ آج ڈاکٹر صاحب نے بڑے سروسامان سے بخار روکنے کی تیاریاں کی ہیں، مگر دیکھیے، میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے[2]۔

مَیں اِن شاء اللہ، اگر اچھا ہو گیا تو اسی [اپریل کے] مہینے کشمیر جاؤں گا اور ڈیڑھ دو ماہ رہوں گا۔ کشمیر کا دیکھنا کچھ کم نہیں، یہاں نہ دیکھا تو قیامت میں اگر چہ اس کا نمونہ دیکھنے میں آئے گا، مگر اصل و نقل میں پھر فرق ہے[3]، [لیکن بخار کے باعث کشمیر جا نہ سکا]۔

....

مَیں نے سرسری طور سے [خاندانی جائداد سے متعلق] اقرار نامے کو دیکھا، اب دوبارہ اس پر نگاہ ڈالتا ہوں تو وہ بالکل ایک مہمل اقرار نامہ معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت مولوی عبداللطیف صاحب سید پوری قائم مقام منصب کا سنگج میرے بنگلے پر ہیں، وہ بھی مجھ سے متفق ہیں۔ اوّل تو یہ بحث ہے کہ والد نے [ہماری سوتیلی] والدہ کو جو ہبہ کیا تھا، وہ محض بے سروپا چیز ہے۔ اس کا تذکرہ، کیا حاصل! اولاً تو اس کا کوئی ثبوت نہیں، ثانیاً وہ تمام کارروائی اس اقرار نامے سے باطل ہو چکی، جو والد اور اعمام میں ہوا۔ اس کی بِنا پر کسی بات کو مبنیٰ کرنا

۱: بنام محمد سمیع، ۱/۴/۱۸۹۲ء، اوّل، ۹۵، ۲: بنام محمد سمیع، ۵/۴/۱۸۹۲ء، اوّل، ۹۶،
۳: ایضاً

بناء الفاسد علی الفاسد ہے، بلکہ بدگمانی پیدا کرنے والا ہے۔اب بحث یہ ہے کہ ہم لوگ اس وقت تک کسی جائداد کے مالک نہیں ہیں، کیونکہ والدہ کا ہبہ محض فضول ہے اور تقسیم نامہ اخیر میں ہم لوگوں کو خود کچھ نہیں دیا گیا، بلکہ براتِ عاشقاں برشاخِ آہو۔اسی ہبہ مفروضۂ والدہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جب ہم لوگ کسی جائداد کے مالک نہیں ہیں تو دست برداری کیسی اور معاوضہ کیسا؟ اربابِ چھاؤنی [یعنی سوتیلی والدہ] کی دست برداری کے مقابلے میں ہماری طرف سے کیا معاوضہ ہے اور اگر نہیں ہے تو یہ کس قسم کا معاہدہ ہے، جس کا کوئی بدل نہیں۔اصل یہ ہے کہ اگر والد قبلہ کو اَور زیادہ تر کانٹوں میں الجھانا ہے تو وہ جس قدر چاہیں، الجھائیں؛ لیکن اگر صفائی سے کوئی معاملہ کرنا ہے تو اس کی صرف یہ تدبیر ہے کہ جس قدر حصہ زائد فریقِ سوم کو دیا گیا ہے، وہ بذریعہ بیع کے فریقِ دوم کی طرف رجوع کرے اور فریقِ دوم کا اصلی حصہ بذریعہ ہبہ نامہ منتقل کیا جائے۔اس کے سوا اَور سب تدبیریں سبز باغ ہیں، جس کو مَیں بہت دیکھ چکا ہوں۔ یہ مَیں جانتا ہوں کہ یہ تدبیر نہ والد قبلہ کو منظور ہے، نہ اربابِ چھاؤنی کو اور سب سے زیادہ ماموں مہدی کو؛ لیکن یہ حالت ہے تو نمائش سے کیا فائدہ! جو ہو چکا، ہو چکا؛ فریقِ دوم کچھ نالش فریاد نہیں کرتا، بے فائدہ فکر کیوں کی جاتی ہے۔اس قسم کی مہمل دستاویزوں سے، جو پھوہڑ کی کھیر سے بڑھ کر ہیں، کیا حاصل ہے[۴]۔

....

جس زمانے میں مجھ کو ہیروز آف اسلام کا خیال پیدا ہوا، اُسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے، وہ اس مقصد کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہوسکتا۔یہی خیال تھا، جس نے اوّل اوّل [مصر و روم کے] اس سفر کی تحریک دل میں پیدا کی، کیونکہ یہ یقین تھا کہ مصر و روم میں اسلامی تصنیفات کا جو بقیہ رہ گیا ہے، اُن سے ایک ایسا سلسلۂ تالیف ضرور تیار ہوسکتا ہے۔ اگرچہ یہ عزم مستقل ہو چکا تھا، لیکن چند در چند اسباب سے دیر ہوتی گئی، یہاں تک کہ بظاہر اسباب نا اُمیدی پیدا ہوگئی اور وہ عزم ایک

۴: بنام محمد اسحاق، ۱۸۹۲/۴/۱۱ء، اوّل، ۲۸-۲۹

ضعیف سا خیال رہ گیا۔ مَیں اکثر بیمار رہا، یہاں تک کہ علاج سے تنگ آ کر تبدیل آب وہَوا کا ارادہ کیا، چنانچہ مکان وغیرہ کے بندوبست کے لیے الموڑہ اور کشمیر میں دوستوں کو متعدد خط لکھے۔ اسی اثنا میں معلوم ہوا کہ مسٹر آرنلڈ، جو مدرسۃ العلوم [علی گڑھ] کے پروفیسر فلاسفی اور میرے استاد ہیں (مَیں نے اُن سے فرنچ زبان سیکھی ہے) آج ہی کل ولایت جانے والے ہیں۔ دفعتہً خیال آیا کہ مصر و روم کا سفر، آب وہَوا کی تبدیلی، مسٹر آرنلڈ کا ساتھ؛ اتفاق سے یہ سامان جمع ہو گئے ہیں، اس موقع کو ہرگز ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے؛ چنانچہ اُسی وقت صاحبِ موصوف کے پاس گیا کہ مَیں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ انھوں نے نہایت خوشی ظاہر کی اور فرمایا کہ جہاں تک ممکن ہے، سفر کے ضروری کاموں میں تم کو کافی مدد دُوں گا۔[۵]

اُس وقت جہاز کی روانگی کو کُل تین چار روز باقی تھے۔ احباب اور اعزّہ نے سنا تو سخت متعجب ہوئے اور اکثروں نے سمجھایا کہ اس جلدی اور بے سروسامانی کے ساتھ اتنا لمبا سفر کون سی دانش مندی کی بات ہے۔ مَیں نے کہا، ہرچہ بادا باد من کشتی در آب انداختم۔ کالج میں گرمیوں کی تعطیل معمولاً تین مہینے کی ہوا کرتی ہے۔ مدتِ ملازمت کے لحاظ سے مجھ کو تین مہینے کی پریولج [privilage] رخصت کا حق حاصل تھا، اس طرح دونوں کو ملا کر چھ مہینے کی رخصت مل گئی اور ۲۶ / اپریل ۱۸۹۲ء کو مَیں علی گڑھ سے چل کھڑا ہوا۔ مسٹر آرنلڈ اپنے ایک دوست سے ملنے کے لیے ایک دو دِن پہلے جھانسی روانہ ہو گئے تھے۔ جھانسی کے اسٹیشن سے اُن کا ساتھ ہوا اور تمام راہ بڑے لطف و مسرت سے کٹی۔ مسٹر آرنلڈ نے حاجی رحمت اللہ بن داوَدکو، جو بمبئی کے ایک معزز اور روشن ضمیر تاجر ہیں، خط کے ذریعے سے اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی، جس میں میری معیت کا بھی ذکر تھا۔ چونکہ اتفاقاً ہمارے پہلے انتظام میں کسی قدر تبدیلی ہو گئی، ہم لوگ تاریخِ معینہ کے دو دِن بعد بمبئی پہنچے۔ مسٹر آرنلڈ میرا اور اپنا اسباب لے کر وسٹن ہوٹل کو گئے، مَیں بازار میں پھر رہا تھا کہ ایک لڑکے سے ملاقات ہوئی۔ مَیں نے اُس سے پوچھا کہ تم حاجی رحمت اللہ کو جانتے ہو؟ بولا کہ 'آپ

۵: سفرنامہ،۱۳-۱۵

مولوی شبلی تو نہیں ہیں؟" میں نے اُس کے اس تفرس پر، جو کشف سے کم نہ تھا، حیرت زدہ ہو گیا۔ اُس نے کہا، "ہم دو دن سے آپ کے لیے حیران ہوتے ہیں۔ چلیے، حاجی [رحمت اللہ بن داؤد] صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" حاجی صاحب نے مسٹر آرنلڈ کو بھی ہوٹل سے بلا لیا اور ہم دونوں اُن کے باغ میں ٹھہرے۔[۶]

جس روز ہم بمبئی پہنچے، اس کے دوسرے دن ہمارا جہاز روانہ ہونے کو تھا، اس لیے ہم نے اپنا تمام وقت سفر کے ضروری کاموں میں صرف کیا اور بمبئی میں جو اسلامی مدرسے اور انجمنیں ہیں، ان کی سیر نہ کر سکے۔ کک کمپنی کی معرفت جہاز کا ٹکٹ لیا۔ جس جہاز پر ہم جانے والے تھے، اس کا کرایہ پورٹ سعید تک سیکنڈ کلاس کا دو سو دس روپے تھا۔ پہلی مئی کو نو بجے ہم جہاز پر سوار ہوئے۔ قریباً بارہ بجے جہاز نے لنگر اُٹھایا اور ہم نے بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا پڑھ کر ہندوستان کو خدا حافظ کہا۔[۷]

....

جہاز کی حرکت اوّل اوّل تو چنداں ناگوار نہیں معلوم ہوئی لیکن شام کے قریب طبیعت متغیر ہونی شروع ہوئی۔ رات کا کھانا کھا کر سو رہے، صبح کو آنکھ کھلی تو عجیب کیفیت تھی۔ دورانِ سر اور متلی کی ایسی سخت تکلیف تھی، جو کسی طرح بیان میں نہیں آ سکتی۔ دو دِن غشی کی سی حالت رہی۔ جہاز کا ملازم کبھی کبھی نارنگیاں لاتا تھا کہ کچھ کھالو، لیکن ان چیزوں کے دیکھنے سے اُبکائی آتی تھی۔ مسٹر آرنلڈ چائے پی لیا کرتے تھے، اگرچہ ہضم نہیں ہوتی تھی، لیکن قے کرنے سے طبیعت ہلکی ہو جاتی تھی۔ ان کے اصرار پر مَیں نے بھی دو ایک بار چائے پی کر قے کی اور فائدہ محسوس ہوا، تیسرے دِن ہم سب اُٹھ بیٹھے۔[۸]

سنا کرتے تھے کہ سمندر کی ہَوا تندرستی کے لیے نہایت مفید ہے، درحقیقت جہاز کا سفر سو علاجوں کا ایک علاج ہے۔ مَیں جہاز پر سوار ہونے کے وقت تک ضعیف اور مضمحل تھا،

۶: ایضاً، ۱۳۔ ۱۴
۷: ایضاً، ۱۴
۸: ایضاً، ۱۴۔ ۱۵

لیکن روز بروز چاق و چست ہوتا گیا۔ طبیعت کو ہر وقت نشاط رہتا تھا اور بھوک خوب لگتی تھی۔ ہم لوگوں کو پانچ وقت کھانا ملتا تھا، یعنی صبح کو آٹھ بجے چائے، دودھ بسکٹ؛ گیارہ بجے ڈنر، جس میں معمولی گوشت کے علاوہ مرغ، بط، کبوتر، ہر قسم کی پڈنگ، تر اور خشک میوے ہوتے تھے؛ کبھی کبھی برف کی قفلیاں [حال: قلفیاں] بھی ہوتی تھیں۔ رات کو نو بجے چائے اور مکھن۔ ہر وقت کا کھانا پیٹ بھر کر کھاتے تھے اور سب ہضم ہو جاتا تھا۔ مَیں تمام دِن دریا [سمندر] کے سیر و تماشے میں مشغول رہتا تھا۔[9]

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جہاز پر پرند جانور ذبح نہیں کیے جاتے اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے اپنے سفرنامے میں تجربے سے اس کی تصدیق بھی کی ہے، مَیں نے دو تین روز تک پرند کے گوشت کھانے سے پرہیز کیا۔ مسٹر آرنلڈ نے مجھ سے اس کا سبب پوچھا؛ مَیں نے کہا، ہمارے مذہب میں منخنقہ حرام ہے۔ بولے کہ اس جہاز پر جانور ذبح کیے جاتے ہیں، گردن مروڑ کر مارے نہیں جاتے۔ چونکہ شرعاً ان کی تنہا شہادت کافی نہ تھی، مَیں خود گیا اور اس کی تصدیق کی۔ ذبح کرنے والا عیسائی تھا، وہ ذبح کرتے وقت کچھ پڑھتا نہ تھا، صرف گردن پر چھری پھیر دیتا تھا۔ اگرچہ حنفیوں کے یہاں یہ ذبیحہ حلال نہیں، لیکن اس مسئلے میں چند دنوں کے لیے مَیں شافعی بن گیا تھا، جن کے ہاں ہر طرح کا ذبیحہ جائز ہے۔[10]

حالاتِ سفر میں ایک قصیدہ موزوں ہو گیا۔[11] درحقیقت سمندر کی فضا کچھ ایسی دلچسپ اور نشاط انگیز ہے کہ موزوں طبع آدمی جہاز کے سفر میں خواہ مخواہ گنگنا اُٹھتا ہے۔[12]

....

۷رمئی ۱۸۹۲ء کو جہاز عدن پہنچا اور کنارے سے کسی قدر فاصلے پر لنگر انداز ہوا۔ عدن میں بڑی دلچسپی یہ ہے کہ سمالی [صومالی] قوم کے بہت سے لڑکے ڈونگیوں پر سوار جہاز کے قریب آتے ہیں اور جہاز والوں سے انعام لینے کے لیے عجیب عجیب مبتذل حرکتیں کرتے

۹: ایضاً، ۱۵ — ۱۰: ایضاً، ۱۶

۱۱: بنام سرسید، ۱۸۹۲/۵/۲۵ء، اوّل، ۳ — ۱۲: سفرنامہ، ۱۶

ہیں۔ کچھ ناچتے گاتے ہیں، کچھ آپس میں مل کر چند بے معنی الفاظ کہتے ہیں اور بغلیں بجاتے جاتے ہیں۔ بڑا کمال یہ ہے کہ لوگ دوانّی چونّی پیسے جو کچھ انعام دینا چاہتے ہیں، سمندر میں پھینک دیتے ہیں اور وہ غوطے مار کر نکال لاتے ہیں۔ اکثر انگریز اس تماشے میں مصروف تھے اور آرنلڈ کو بھی اس میں مزہ آتا تھا، لیکن میری کچھ اَور حالت تھی۔ چونکہ غلطی سے میرا یہ خیال تھا کہ یہاں عموماً عرب آباد ہیں، اس لیے یہ طبعی بات تھی کہ مَیں اُن کو عزت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا، لیکن وہ انعام لینے کے لیے ایسی مبتذل، ناموزوں اور حقیر حرکات کرتے تھے کہ کسی طرح طبیعت کو گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔ عبرت ہوتی تھی کہ عرب کی اب یہ حالت ہے کہ غیروں کے سامنے اس قسم کی حرکات سے اُن کو شرم نہیں آتی۔ ان خیالات سے بے اختیار میرا دل بھر آیا تھا، یہاں تک کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بے اختیار زبان سے نکلا کہ قم یا عمرؓ!۔ شہر میں جا کر جب مَیں نے تحقیق کی اور تمام باتوں سے ثابت ہو گیا کہ سمالی قوم عرب نہیں ہے تو مجھ کو کسی قدر تسکین ہوئی۔ یہی غصہ اور رنج تھا، جس کی وجہ سے مَیں نے قصیدۂ سفریہ میں اس کم بخت قوم کی سخت ہجو کی ہے اور درحقیقت وہ اس کے مستحق ہیں[۱۳]:

ہفتم ماہ مئی چوں برسیدیم عدن
کشتی آسود و بینداخت زمانے لنگر
من فرود آمدم وروی بشہر آوردم
تا خبر جویم ازین مملکت از بدو و حضر
کوہساریست کہ ہرچند بلندست و فراخ
لیک از سبزہ و گُل نیست درد ہیچ اثر
ہر کجا می گذری ریگ روانست و خزف
ہر طرف می نگری خاک سیاہست و حجر

۱۳: ایضاً، ۱۶-۱۷

گبر و ترسا کہ نزیل اند دریں بقعہ ہمہ
بزبانِ عربی حرف زدندے یکسر
مردمِ شہر کہ خود را بہ سہالی نامند
حیوان اند نہ بل از حیوان ہم بدتر
خوار و بدبخت و تبہ کار و سیہ چردہ و زشت
سفلہ و ممتہن و کج روش و بد گوہر
خویشتن را بہ عرب بستہ و حاشا کہ عرب
ایں چنیں خوار و زبوں شان پسندد داور
چوں زبان ہمہ تازی بود و ہم چو عرب
نام شاں بستہ بود با لقب جد و پدر
عامیاں در غلط افتند و گماں باز برند
کہ مگر در نسب و نسل از معد اند و مضر
تخم و ہم ریشہ ایں نخل ز خاکِ حبش ست
کہ دریں جاے ببار آمد و افشاند ثمر
شامگہ کشتیِ ما باز برفتار آمد
تا بیک ہفتہ گذر کرد ز بحر الاحمر[۱۴]

چونکہ وقت کم تھا، اس لیے مَیں شہر [عدن] کے اندرونی حصے کو نہ دیکھ سکا۔ عدن کی زبان عموماً عربی ہے اور پارسی، ہندو، بنگالی، جو تجارت یا نوکری کے ذریعے سے یہاں رہتے ہیں، بے تکلف عربی بولتے ہیں۔ چونکہ مَیں نے کبھی کسی ہندو کی زبان سے اس مقدس زبان کے الفاظ نہیں سنے تھے، بنیوں اور بقالوں کی این تروح ماتبغی بولتے دیکھ کر عجب مزہ آتا تھا۔ یہاں کی زبان گو عربی ہے، لیکن نہایت بے ہودہ اور غیر فصیح ہے۔ اگرچہ آج کل تمام

۱۴: کلیات فارسی، ۱۹-۲۰

ملکوں میں، جہاں عربی بولی جاتی ہے، قدیم عربی نہیں رہی، لیکن عدن کی زبان سب سے نرالی ہے۔ دو چار معمولی الفاظ کے سوا مَیں کچھ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ غالبًا یہاں کی زبان ایک مدت سے اجنبیوں کے اختلاط کی وجہ سے خراب ہوتے ہوتے اس حالت کو پہنچی ہے۔[۱۵]

....

۱۰ ارمئی کی صبح کو مَیں سوتے سے اُٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے۔ انجن بالکل بے کار ہو گیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہَوا کے سہارے چل رہا تھا۔ مَیں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے۔ اس اضطراب میں اَور کیا کر سکتا تھا، دَوڑا ہُوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا۔ وہ اُس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مَیں نے ان سے کہا کہ آپ کو کچھ خبر بھی ہے؟ بولے کہ ہاں، انجن ٹوٹ گیا ہے۔ مَیں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں؟ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا کیا موقع ہے؟ فرمایا کہ جہاز کو اگر برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اَور بھی قدر کے قابل ہے اور ایسے قابلِ قدر وقت کو رائگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے۔ ان کے استقلال اور جرأت سے مجھ کو بھی اطمینان ہُوا۔ آٹھ گھنٹے کے بعد انجن درست ہُوا اور بدستور چلنے لگا۔[۱۶]

....

۱۳ ارمئی کو جہاز سویز پہنچا اور تین چار گھنٹے کے لیے ٹھہرا۔ مصری عرب پنیر، کھجور، روٹیاں بیچنے کے لیے لائے۔ ان میں سے ایک نے مجھ کو ہندوستانی خیال کر کے اردو میں باتیں کرنی شروع کیں۔ مجھ کو تعجب ہُوا اور جب دریافت سے معلوم ہُوا کہ اس نے کبھی ہندوستان کی صورت نہیں دیکھی تو اردو کی عالمگیری پر مجھ کو اَور بھی تعجب ہُوا۔[۱۷]

....

۱۴ ارمئی کو ہم پورٹ سعید پہنچے اور نہایت افسوس کے ساتھ مجھ کو مسٹر آرنلڈ سے جدا ہونا

۱۵: سفرنامہ، ۱۷-۱۸ ۱۶: ایضاً، ۱۹

۱۷: ایضاً، ۲۰

پڑا۔ بمبئی سے مَیں نے برنڈزی تک کا ٹکٹ لیا تھا۔ پورٹ سعید پہنچ کر یہ خیال ہُوا کہ برنڈزی تک تو آرنلڈ کا ساتھ ہے، لیکن وہاں سے قسطنطنیہ تک ایک ہفتے کا سفر ہے، اتنی مدت تک محض اجنبیوں سے سابقہ اور زبان اور ملک کی اجنبیت کی وجہ سے ہر کام میں دِقت ہو گی، اس خیال کی بنا پر مَیں نے پہلی اسکیم بالکل بدل دی اور ارادہ کر لیا کہ شام کے راستے سے قسطنطنیہ جاؤں گا۔ جہاز نے جس وقت لنگر کیا، کک کمپنی کا ایک ملازم اپنے مسافروں کی خبر گیری کے لیے جہاز پر آیا۔ کک کمپنی کی طرف سے ایک چھوٹی سی کشتی ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ ہم کنارے پر پہنچے تو [کمپنی کا ملازم] شیمویل پہلے سے ہمارے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ متعدد زبانیں جانتا ہے اور بالخصوص عربی، انگریزی، فرنچ نہایت بے تکلفی سے بول سکتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اردو میں بھی نہایت آسانی سے بات چیت کر سکتا ہے[18]۔ یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ قسطنطنیہ جانے والا جہاز اُس وقت تیار تھا، ورنہ پندرہ دِن تک پورٹ سعید میں ٹھہرنا پڑتا[19]۔ اوّل اوّل جب مَیں اس شہر کی سیر کو نکلا تو ہر چیز کو بڑے شوق اور استغراب کی نگاہ سے دیکھتا تھا، کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ مَیں نے سلطنت اسلام کی آبادی دیکھی۔ (حرمین شریفین کی زیارت سے گو اس سے پہلے مشرف ہو چکا تھا، لیکن وہ خدا کا ملک ہے اور مَیں دنیوی سلطنت اور حکومت کا ذکر کر رہا ہُوں)، جب کوئی بلند اور شاندار عمارت دیکھتا تو اس خیال سے خوش ہوتا کہ الحمد للہ، ان ملکوں میں مسلمان خوش حال اور دولت مند ہیں، لیکن دریافت کرنے کے بعد معلوم ہوتا کہ کسی یورپین سوداگر کا مکان ہے۔ سارے شہر میں ایک بھی عمدہ دُکان یا بلند عمارت کسی مسلمان کی نہ تھی۔ افسوس ع...... بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست۔ تھوڑی دیر بازار میں پھر پھرا کر قسطنطنیہ جانے والے جہاز پر سوار ہُوا۔ شیمویل اور مسٹر آرنلڈ ساتھ تھے۔ چونکہ بیت المقدس کے حج کا زمانہ تھا، اس لیے فرسٹ اور سیکنڈ دونوں درجے عیسائی حاجیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ مسٹر آرنلڈ نے کہا: 'مجھ کو ڈر ہے کہ تم کو تکلیف نہ پہنچے۔ یہ لوگ مذہب کے سخت پابند ہیں اور اس لیے ضرور ہے کہ ان میں

۱۸: ایضاً، ۱۹، ۲۰

۱۹: ایضاً، ۲۱

تعصب ہو۔ تم غیر مذہب، غیر قوم، تمھاری معیت ان کو کیونکر گوارا ہو گی، لیکن مجھ کو تجربے کے بعد معلوم ہوا کہ مسٹر آرنلڈ کا خیال صحیح نہ تھا۔ وہ لوگ پابندِ مذہب تھے، لیکن فرنچ اور اٹالین تھے، انگریز نہ تھے؛ اس لیے کم آمیزی اور فاتح و مفتوح کا امتیاز، جو فاتح قوم کی مخصوص صفتیں ہیں، اُن میں بالکل نہ تھیں[20]۔

۱۵ رمئی کو جہاز یافہ پہنچا۔ ہمارے اکثر یورپین ہم سفر یہاں اُتر گئے۔ بیت المقدس یہاں سے صرف رات بھر کا راستہ ہے۔ چونکہ وقت کم تھا، اس لیے مَیں یہاں نہ اُتر سکا[21]۔

....

۱۶ رمئی کو بیروت پہنچے۔ چونکہ یہ ایک تاریخی مقام اور نہایت قدیم شہر ہے، اس لیے مَیں اُس کے دیکھنے کا بہت شائق تھا۔ کنارے پر پہنچ کر بڑی دِقت پیش آئی کہ وہاں تذکرہ، یعنی پروانۂ راہداری کے بغیر کسی کو اُترنے نہیں دیتے۔ مَیں ہندوستان سے اس عجلت میں چلا تھا کہ پاسپورٹ لینے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ پہلے تو مَیں بہت گھبرایا کہ افسوس یہ سیر مفت میں رہی جاتی ہے، لیکن پھر خیال آیا اور مَیں نے اُن لوگوں سے کہا کہ مَیں یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا، صرف سیر کرنی مقصود ہے۔ ان لوگوں میں سے ایک نے، خدا جانے، کیونکر پہچانا کہ مَیں ہندوستان کا رہنے والا ہوں، غریب الوطن سمجھ کر مہربانی کی اور ایک آدمی ساتھ کر دیا کہ یہ شہر کی سیر کرا دے گا[22]۔ چونکہ پہلے سے ارادہ تھا کہ قسطنطنیہ سے واپس آتے ہوئے یہاں دو ایک روز قیام کروں گا، اس لیے اِس دفعہ صرف سرسری طور پر بازار وغیرہ کی سیر کی۔ کتابوں کی دُکانیں دیکھیں، گزرگاہِ عام پر ایک قہوہ خانہ تھا، تھوڑی دیر تک وہاں ٹھہرا اور راہ چلتوں کا تماشا دیکھتا رہا۔ جب کوئی شخص شان و شوکت کے ساتھ گاڑی یا گھوڑے پر سوار سامنے سے گزرتا تو مَیں اپنے رہنما سے پوچھتا کہ کون ہے؟ اور اکثر وہ یہ جواب دیتا کہ 'عیسائی'۔ یہاں سب سے زیادہ مجھ کو یہ بات پسند آئی کہ تمام دُکاندار اور پیشے والے، حتیٰ کہ قلی اور مزدور بھی نہایت خوش وضع اور پاکیزہ لباس تھے۔ تین چار گھنٹے اِدھر اُدھر پھر کر واپس آیا۔

۲۰: ایضاً، ۲۱-۲۲ ۲۱: ایضاً، ۲۲
۲۲: ایضاً

ایک اٹھنّی رہنما صاحب کی نذر کی اور اُن سے رخصت ہو کر جہاز پر پہنچا۔[۲۳]

بمبئی سے پورٹ سعید تک جہاز پر کوئی مسلمان نہ تھا، یہاں پہنچ کر دو ایک مسلمان نظر آئے اور بیروت میں تو سارا جہاز شامی عربوں سے بھر گیا۔ بدقسمتی سے فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کو تو یہ عزت نصیب نہیں ہوئی، لیکن تیسرے درجے میں ہر طرف مسلمان ہی مسلمان تھے۔ مَیں شروع سفر سے مسلمانوں کی صورت کو ترس گیا تھا، یہ مجمع دیکھ کر حد سے زیادہ خوشی ہوئی۔ فرسٹ کلاس کی چھت نہایت صاف اور پُر فضا جگہ تھی اور مَیں اکثر وہیں بیٹھ کر دریا کی سیر کیا کرتا تھا، لیکن جب یہ صحبت نصیب ہوئی تو مَیں نے بھول کر بھی اُدھر قدم نہیں رکھا۔ اوّل اوّل مجھ کو ان [مسلمان] لوگوں سے میل جول پیدا کرنے میں سخت دِقت پیش آئی۔ یہ لوگ چھت پر جا بجا پھیلے ہوئے تھے اور دو دو چار چار آدمیوں کی الگ الگ جماعتیں تھیں۔ مَیں بڑے شوق سے اُن کے پاس گیا، لیکن وہ مطلقاً متوجہ نہ ہوئے۔ جس شخص کے پاس کھڑا ہُوا، اُس نے ایک بار آنکھ اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن نیچی کر لی۔ مجھ کو اس بداخلاقی پر سخت تعجب ہُوا۔ دل میں کہتا تھا کہ عربوں کی مہمان نوازی کی یہ کچھ تعریفیں سنی تھیں، ان کو تو بات چیت میں بھی مضائقہ ہے۔ ان میں مدرسۂ حربیہ [قسطنطنیہ] کے چند طلبہ تھے، جو رخصت لے کر وطن میں آئے تھے اور اب قسطنطنیہ جا رہے تھے۔ وہ کبھی دِل بہلانے کے لیے عربی دیوان پڑھا کرتے تھے۔ مَیں نے خیال کیا کہ ہم فنی کے ذریعے سے تعارُف پیدا کروں، چنانچہ اُن کے پاس گیا اور دخل در معقولات کے طور پر اپنی مولویت اور علمیت جتانی شروع کی، وہ اس پر بھی متوجہ نہ ہوئے۔ مَیں اپنا سا منہ لے کر چلا آیا، لیکن مجھ کو یقین تھا کہ اس واقعے کا ضرور کوئی خاص سبب ہے۔ اتفاقاً ایک موقع پر ایک شخص نے میرا مذہب پوچھا، مَیں نے کہا، 'اسلام'۔ بولا، لا واللہ اھذا طربوش المسلم، یعنی 'ہرگز نہیں، کہیں مسلمان بھی ایسی ٹوپی اوڑھتے ہیں'۔ بدقسمتی سے میرے سر پر ایرانی ٹوپی تھی اور اس وجہ سے تمام عرب مجھ کو مجوسی سمجھتے تھے۔ یہ معما جب حل ہُوا تو مَیں نے اُن لوگوں کے دل سے اس بدگمانی

۲۳: ایضاً، ۲۳

کو رفع کر دیا اور پھر وہ ایسے شیر وشکر ہوئے کہ ایک دم کو بھی جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ مدرسۃ حربیہ کے طلبہ سے زیادہ صحبت رہتی تھی۔ قسطنطنیہ کے متعلق مَیں نے بہت سی ضروری باتیں اُن سے دریافت کیں اور درحقیقت اِن معلومات سے مجھ کو بہت فائدہ ہُوا۔[۲۴]

....

۷ا مئی کو جہاز سائپرس [قبرص] پہنچا۔[۲۵] اس جزیرے میں لرنکہ [Larnaca] اور لماسون [لماسول Limassol] دو بڑے شہر ہیں اور دونوں جگہ جہاز تھوڑی دیر کے لیے لنگر کرتا ہے۔ مَیں نے لماسون کی سیر کی۔ چونکہ یہاں انگریزی حکومت ہے، اس لیے راہداری کے پروانے کی پُرس وجو نہ تھی۔ مَیں داخل ہوا تو میرے سر پر ایرانی ٹوپی اور بدن پر شروانی اچکن تھی۔ غالباً وہاں کے لوگوں نے یہ وضع کبھی دیکھی نہ تھی، مَیں جدھر سے گزرتا، لوگ تعجب سے دیکھتے اور کہیں کھڑا ہو جاتا تو تماشائیوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ سب سے پہلے مَیں جامع مسجد میں گیا۔ مسجد کے متصل ایک مکتب ہے؛ وہاں ایک مولوی صاحب، جو نہایت باوقار اور خوش لباس تھے، ابتدائی صفوں کو درس دے رہے تھے۔ مَیں نے سلام علیک کی، وہ کھڑے ہو گئے اور نہایت مہربانی سے سلام کا جواب دے کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لڑکے تپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے، مَیں بھی ان کے برابر بیٹھ گیا۔ مولوی صاحب کے اشارے پر ایک لڑکے نے قرآنِ مجید کی چند آیتیں پڑھیں، میرے دل پر عجیب اثر ہُوا۔ خیال آتا تھا کہ کہاں وہ حجاز کا ریگستان! کہاں بحیرۂ روم کے دُور دراز جزیرے! اس مقدس کلام (قرآن) میں کیا تاثیر تھی کہ مشرق سے مغرب تک برقی قوت بن کر دَوڑ گئی اور آج تک باقی ہے۔ وہ معصوم لڑکا خوش لحن بھی تھا اور اصولِ قرأت کے مطابق پڑھتا تھا، اتفاق سے آیتیں بھی مؤثر تھیں۔ ان باتوں نے مجھ کو بالکل مدہوش کر دیا اور دیر تک ایک عجیب حالت طاری رہی۔[۲۶]

۲۴: ایضاً، ۲۳۔۲۴
۲۵: ایضاً، ۲۴
۲۶: ایضاً، ۲۵

۱۸ رمئی کو جہاز رودس [Rhodes] پہنچا اور تین چار گھنٹے ٹھہرا۔ یہ چھوٹا سا جزیرہ ہے، قدامت کے لحاظ سے اس کی سیر کا مشتاق تھا، لیکن بدقسمتی سے رات کا وقت تھا اور جہاز والوں میں سے اَور کسی نے میرا ساتھ نہ دیا۔ زیادہ بدقسمتی یہ کہ واپسی کے وقت بھی اتفاق سے یہی اسباب پیش آئے اور اس کی سیر سے بالکل محروم رہ گیا۔[۲۷]

....

۲۰ رمئی صبح کے وقت ازمیر [Izmir] پہنچے۔ چونکہ یہ ایک بہت بڑا بندرگاہ ہے، جہاز دو روز تک یہاں مقیم رہا۔ مَیں اپنے شامی دوستوں کے ساتھ جہاز سے اُترا۔ کنارہ پر وہی تذکرہ (پروانۂ راہداری) کی باز پرس تھی، لیکن ساتھیوں کی بدولت مجھ کو چنداں زحمت نہیں ہوئی۔[۲۸] مَیں نے مدرسوں کی سیر کرنی چاہی، لیکن چونکہ جمعے کا دِن تھا، تمام مدرسے بند تھے۔ نمازِ جمعہ جامع حصار میں پڑھی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد مَیں کتب خانے میں گیا۔ یہ کوئی بڑا کتب خانہ نہیں ہے، مسجد کے کونے میں ایک چھوٹا سا حجرہ ہے اور کتابوں کی تین چار چھوٹی چھوٹی الماریاں ہیں۔ نماز کے بعد اکثر علما اور اربابِ تصانیف یہاں آ کر بیٹھتے ہیں۔ سلام علیک اور مزاج پُرسی کے بعد ایک صاحب نے فرمایا کہ 'ہم لوگ ابھی ایک مسئلے کے متعلق گفتگو کرتے تھے، اگر آپ پسند کریں تو وہ مسئلہ پھر چھیڑا جائے'۔ مَیں نے خوشی سے منظور کیا۔ یہ لوگ عربی نہیں سمجھتے تھے، اس لیے مَیں فارسی زبان میں گفتگو کرتا تھا۔[۲۹]

ان ملکوں میں بحث و مذاکرہ کا یہ طریقہ عموماً رائج ہے اور نہایت شائستہ طریقے پر ہے، اجنبی شخص کو علما کے گروہ سے ملنے اور اُن سے ربط و اختلاط پیدا کرنے کا اس سے زیادہ آسان اور مفید کوئی ذریعہ نہیں۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ مناظرہ نفسانیت اور ترفع کے لحاظ سے نہیں ہوتا، بلکہ اثنائے تقریر میں اگر ان کو انداز سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مخاطب اعتراض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تو قصداً دوسرا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں۔ اس قسم کی علمی مجلسیں اس سفر میں میری کامیابی کا بڑا ذریعہ تھیں اور بعض جگہ تو انھی کی بدولت مجھ کو ایسی دُشواریوں سے نجات

۲۷: ایضاً
۲۸: ایضاً
۲۹: ایضاً، ۲۸-۲۹

ملی، جن سے رہائی کی اور کوئی تدبیر نہ تھی۔[۳۰]

۲۱ر مئی کو شام کے قریب جہاز نے لنگر اُٹھایا۔ یہاں سے قسطنطنیہ تک کوئی بڑا اسٹیشن نہیں ہے۔ بعض مقامات پر جہاز تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرا، لیکن ہم اُتر نہ سکے۔ چناق قلعہ [Canakkale] سے آگے بڑھ کر ہم نے ایک عجیب تماشا دیکھا۔ جہاز تیزی سے جا رہا تھا کہ دُور سے پانی میں ایک فوارہ سا چھوٹتا نظر آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہُوا کہ سامنے سے چار پانچ مچھلیاں جہاز کی طرف دَوڑی آ رہی ہیں۔ قریب آ گئیں تو جہاز کے ساتھ ہو لیں۔ اُن کا جسم پانی کی سطح سے صاف نظر آتا تھا۔ جہاز اگرچہ نہایت تیزی سے جا رہا تھا، لیکن وہ برابر ساتھ ساتھ آتی تھیں۔ کبھی کبھی جب سانس چڑھ جاتی تھی تو بڑے زور سے پھنکار مارتی تھیں، اُس وقت پانی میں فوارہ سا چھوٹتا نظر آتا تھا۔ قریباً دو تین میل تک جہاز کے ساتھ ساتھ دَوڑیں۔ تمام لوگ حیرت سے تماشا دیکھتے تھے۔ بعضوں کو خیال ہُوا کہ ان مچھلیوں نے کبھی جہاز کی صورت نہیں دیکھی تھی، اس لیے اس کو کوئی جانور سمجھیں اور مقابلے کے جوش میں چاہتی تھیں کہ جہاز اُن سے بڑھنے نہ پائے۔ [یہ بھی] معلوم ہُوا کہ اس مقام پر ایک دفعہ اتفاق سے یہ مچھلیاں آ گئی تھیں اور جہاز کے ملازموں نے ان کے لیے کھانے کی کوئی چیز دریا [سمندر] میں ڈال دی تھی، اسی کی طمع پر جب کوئی جہاز اِدھر سے گزرتا ہے تو اکثر مچھلیاں آ جاتی ہیں اور دُور تک جہاز کے ساتھ ساتھ دَوڑتی ہیں۔[۳۱]

....

مَیں ۲۲ر مئی کو یہاں [قسطنطنیہ] پہنچا۔[۳۲] یہ ایسا وقت تھا کہ مجھ کو منزلِ مقصود پر پہنچنے کی نہایت خوشی ہونی چاہیے تھی، لیکن قلیوں اور ملاحوں کے ہنگامے اور شور و غل میں میرے حواس جاتے رہے۔ مَیں نے پہلے سے کچھ طے نہیں کیا تھا اور نہ کر سکتا تھا کہ جہاز سے اُتر کر کہاں جاؤں۔ سخت مصیبت یہ ہوئی کہ شامی احباب، جن سے ہر قسم کی مدد کی توقع ہو سکتی

۳۰: ایضاً، ۲۹   ۳۱: ایضاً، ۳۰-۳۱

۳۲: بنام سرسید، ۲۵/۵/۱۸۹۲ء، اوّل ۱۰

تھی، اُن کو کالج میں پہنچنے کی جلدی تھی، اس لیے وہ میرا انتظار نہ کر سکے۔ میرا اِضطراب اس خیال سے اَور بھی بڑھتا جاتا تھا کہ جہاز پر زبان کی اجنبیت کی وجہ سے یہ دِقت ہے تو شہر میں کیا حال ہوگا؟ آخر خانساماں کو اسباب سپرد کیا اور اس سے کہا کہ مَیں شہر کی سیر کر کے واپس آتا ہوں۔ مقصد یہ تھا کہ پہلے شہر میں جا کر قیام کا کچھ انتظام کر آؤں۔ کنارے پر تذکرے کی پُرس و جو تھی، مَیں نے انگریزی چٹھیاں دِکھائیں، لیکن وہ پاسپورٹ مانگتے تھے؛ غرض، بہ ہزار دِقت رہائی ہُوئی۔ اَب حیران تھا کہ کہاں جاؤں؟ ایک شامی عرب سے، جن کا نام عبدالفتاح تھا، کشتی میں تعارُف ہو گیا تھا؛ مَیں نے اُن سے اپنی پریشانی بیان کی اور کہا کہ 'آپ مجھ کو کوئی معقول طریقہ بتائیں'۔ انھوں نے کہا کہ 'میری حالت بھی تمھارے قریب قریب ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ دونوں ساتھ رہیں'۔ یہ طریقہ اگرچہ احتیاط کے خلاف تھا، لیکن ناواقفیت اور اجنبیت زبان کی وجہ سے مجبوراً اختیار کرنا پڑا اور سچ پوچھیے تو یہی اتفاقی معیت میری تمام کامیابیوں کا دیباچہ تھی۔[۳۳]

یہاں مسافروں کے ٹھہرنے کے چند طریقے ہیں، سب سے زیادہ اطمینان اور آرام ہوٹلوں میں ہے؛ ہوٹلوں کے بعد خانات، یعنی سرائیں ہیں؛ تیسرا طریقہ کرایے کے مکانات ہیں۔ اگرچہ کرایے کا مکان لینا زیادہ آرام کا طریقہ تھا، لیکن مَیں اور میرے شامی دوست دونوں اس طریقے سے ناواقف تھے، اس لیے ایک خان، یعنی سرائے میں جا کر ٹھہرے۔ اس انتظام کی طرف سے اطمینان ہوا تو جہاز پر جا کر اپنا اسباب اُٹھوا لایا۔ چھ سات دِن تک ہم اس خان میں رہے، پھر بابِ عالی کے پاس[۳۴] مَیں نے [۲۵/ مئی] ایک مختصر سا حجرہ گیارہ روپے مہینا کرایے کا لے لیا۔[۳۵]

ایک دِن شیخ علی ظبیان، جن کے والد ایک مشہور صوفی ہیں، شیخ عبدالفتاح سے ملنے آئے۔ مَیں بھی اُس وقت موجود تھا اور اِتفاق سے رسالہ اسکات المعتدی [علی

۳۳: سفرنامہ، ۳۱ ۳۴: ایضاً، ۳۲

۳۵: بنام سرسید، ۱۸۹۲/۵/۲۵ء، اوّل، ۱

انصات المقتدی]، جو میری قدیم تصنیف (مطبوعہ دسمبر ۱۸۸۰ء) ہے اور عربی زبان میں ہے، سامنے رکھا ہوا تھا۔ اُنھوں نے اُٹھا کر دیکھا اور کہا کہ 'آہا! یہ رسالہ، مدت ہوئی، مَیں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا تو اُنھوں نے اِس کے مصنف کی نسبت کہا تھا، شکر اللہ مساعیہ۔' شیخ علی ظبیان کو جب معلوم ہوا کہ وہ رسالہ میری ہی تصنیف ہے تو اُٹھ کر بڑی گرم جوشی سے ملے اور نہایت لطف و مہربانی سے پیش آئے۔ مجھ کو اس بات سے کہ میری ناچیز تصنیف یہاں تک پہنچی اور لوگوں نے اس کو نگاہِ قبول سے دیکھا، نہایت مسرت ہوئی اور سفر کی کسمپرسی میں اتنا ذریعۂ تعارُف بہت غنیمت معلوم ہوا۔ مجھ سے ان کا تعلق روز بروز بڑھتا گیا، یہاں تک کہ باوجود مسافت قریباً ہر روز میرے مکان پر تشریف لاتے اور کبھی کبھی تمام دِن میرے پاس رہتے۔ شیخ عبدالفتاح چند روز کے بعد دمشق کو واپس چلے گئے، اُس تنہائی میں شاید مجھ کو تکلیف پہنچتی، لیکن شیخ علی ظبیان کی غم گساریوں نے تمام تردّدات دل سے دُور کر دیے۔[۳۶]

مکان، جو ہم نے کرایے پر لیا تھا، اگرچہ نہایت خوش فضا اور موزوں تھا، لیکن چونکہ مکان کا مالک نہایت بدمعاملہ اور آوارہ مزاج تھا،[۳۷] اب مَیں ایک دوسرے مکان میں اُٹھ آیا، جو نہایت خوش منظر [اور] تمام ضروریات کا جامع ہے، کرایہ زیادہ تھا، مگر بغیر اس کے چارہ نہ تھا۔[۳۸] فرنیچر وغیرہ سے آراستہ ہے۔ اس میں متعدد کمرے ہیں اور خاص کر میرے کمرے کا کرایہ [پندرہ روپے] ہے، لیکن کوئی وسیع کمرہ نہیں ہے، میری بنگلیہ سے بھی مختصر، بلکہ بہت مختصر ہے۔[۳۹] یہاں مکان کی خوبی کے ساتھ بڑا آرام یہ تھا کہ مالک مکان ایک نیک مزاج عورت تھی۔ اگرچہ اس کا مذہب عیسائی تھا اور قوم کی اٹالین تھی، تاہم بقدرِ ضرورت عربی بول سکتی تھی اور مسلمانوں سے ایک خاص انس رکھتی تھی۔ کھانے پینے کے انتظام کی کچھ ضرورت نہ تھی، ہوٹل اور دُکانیں کثرت سے ہیں اور نہایت مرتب اور پُر تکلف ہیں۔ بازار

۳۶: سفرنامہ، ۳۳ ۳۷: ایضاً

۳۸: بنام حبیب اللہ، ۱۸۹۲/۶/۵ء، اوّل، ۱۲ ۳۹: بنام سرسید، ۵ محرم الحرام ۱۳۱۰ھ، مکتوبات، ۲۴

میں کھانا یہاں مطلق عیب نہیں ہے، مَیں نے اکثر معزز عہدے داروں کو ہوٹلوں میں کھاتے دیکھا۔[۴۰]

....

افسوس ہے کہ یہاں بجز ترکی زبان کے، کسی اَور زبان کا رواج نہیں۔ تمام چیزوں میں دِقت پیش آتی ہے اور اکابر کی ملاقات تو بالکل بے معنی ہوتی ہے۔ نہ وہ میری سمجھتے ہیں، نہ میں اُن کی۔[۴۱] ملا محمد آفندی موصل کے رہنے والے ہیں۔ عربی بقدرِ ضرورت پڑھی ہے، فارسی اچھی طرح بول سکتے ہیں۔ ان کی معاش کا کوئی ذریعہ نہیں، مجبوراً ایک تکیہ میں رہتے ہیں اور فقر و فاقہ سے بسر کرتے ہیں؛ بایں ہمہ نہایت باحمیت اور غیرت مند ہیں۔ مَیں نے جب ترکی سیکھنے کا ارادہ کیا تو ایک دوست نے ان کا نام لیا۔ اُس وقت تک مجھ کو ان سے بالکل تعارُف نہ تھا، اس لیے مَیں نے ۱۰ر ماہوار پر ان کو مقرر کرنا چاہا۔ یہ رقم ان کے لیے عطیہ غیبی تھی، لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ مَیں صرف تحقیقاتِ علمی کے لیے یہاں آیا ہوں تو معاوضہ لینے سے اِنکار کیا اور مفت پڑھاتے رہے۔ اکثر میری قیام گاہ پر آ کر پڑھایا کرتے تھے۔[۴۲] کتابیں یہاں عجائب و غرائب ہیں، لیکن حسرت کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ نہ نقل ہو سکتی ہیں، نہ حافظہ ان کے لیے کافی ہے۔[۴۳] ہر روز تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا ہے۔ بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتب خانے وغیرہ دُور دُور واقع ہیں۔[۴۴]

....

پرسوں عثمان پاشا سے ملا، نہایت اخلاق سے ملے۔[۴۵] یہ وہی نامور جنرل ہے، جس نے پلونا میں چوبیس ہزار روسی مجروح اور آٹھ ہزار تہِ تیغ کیے تھے۔ جس کے مقابلے میں شہنشاہِ روس نے اپنی کُل فوجی قوت صَرف کر دی تھی اور خود سپہ سالار بن کر گیا تھا۔ جس [پاشا] نے باوجود فوج کی کمی اور رسد کی قلت کے، روس کی مجموعی طاقت کا مدت تک مقابلہ

۴۰: سفر نامہ، ۳۴
۴۱: بنام حبیب اللہ، ۱۸۹۲/۶/۵ء، اوّل ۱۲،
۴۲: سفر نامہ، ۱۱۳
۴۳: بنام حبیب اللہ، ۱۸۹۲/۶/۵ء، اوّل ۱۲،
۴۴: بنام سرسید، ۱۸۹۲/۵/۲۵ء، اوّل ۱، ۲، ۳
۴۵: بنام سرسید، ۱۸۹۲/۶/۱۵ء، اوّل ۴،

کیا اور میدان جنگ میں زخمی ہو کر گرفتار ہوا تو خود شہنشاہ روس نے اس کی کمر میں تلوار باندھی اور مہینوں تک اپنا مہمان رکھا۔[۴۶] پلونا کے واقعے کے بعد سلطان نے ان کو کمانڈر انچیف اور صیغہ جنگ کا وزیر کر دیا تھا، لیکن چونکہ اس عہدے کی وجہ سے وہ سلطان کی خدمت میں ہمیشہ حاضر نہیں رہ سکتے تھے، سلطان نے اس عہدے پر فواد پاشا کو مقرر کر دیا اور ان [غازی عثمان] کو مابین کی افسری دی، جس کی وجہ سے وہ زیادہ تر سلطان کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں۔ سلطان کو پاشائے موصوف سے زیادہ کسی عزیز و قریب یا نوکر اور عہدے دار پر اعتماد نہیں ہے اور اس وجہ سے اُن کو اپنے پاس سے جدا نہیں کرتے۔ جمعہ و عید کو، جب سلطان مسجد میں تشریف لاتے ہیں تو اُن کے ساتھ گاڑی میں عثمان پاشا کے سوا اَور کوئی شخص نہیں ہوتا۔[۴۷] قسطنطنیہ میں اگرچہ مَیں کسی فوجی افسر سے نہیں ملا اور نہ ملنا چاہا؛ لیکن یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایسے نادرۂ روزگار کے دیکھنے کا شوق دل میں نہ ہوتا۔ پاشائے موصوف اگرچہ اس رُتبہ کے آدمی ہیں کہ ترکی میں کوئی شخص اُن سے بڑھ کر، بلکہ اُن کی برابر بھی نہیں اور اس لحاظ سے مجھ کو اُن تک رسائی کی کم امید ہو سکتی تھی؛ تاہم شوق کی بے تابی نے نہ مانا اور مَیں ایک مترجم کو ساتھ لے کر اُن کے مکان پر گیا۔ قاعدہ کے موافق ملاقاتیوں کے کمرے میں جا کر بیٹھا۔ قریباً دس منٹ کے بعد ایک ملازم آیا اور مجھ کو بالا خانے پر لے گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پاشائے موصوف تشریف لائے۔[۴۸] عربی سمجھ لیتے ہیں اور دو چار معمولی باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ مَیں نے ان کے ہاتھ کا بوسہ دینا چاہا، لیکن راضی نہ ہوئے، بلکہ اُلٹے خود میری تقلید کرنی چاہی۔[۴۹] مزاج پُرسی کے بعد نام اور مقام پوچھا۔ مترجم نے کہا کہ 'ہندوستان کے علما میں ہیں اور تحقیقاتِ علمی کی غرض سے آئے ہیں'۔ یہ سن کر نہایت مہربانی اور توجہ ظاہر کی اور دیر تک مسلمانوں کے حالات پوچھتے رہے۔[۵۰] رخصت کے وقت فرمایا کہ 'آپ جب چاہیں،

۴۶: سفر نامہ، ۱۱۴ ۴۷: ایضاً، ۱۱۵

۴۸: ایضاً، ۱۱۴ ۴۹: بنام سرسید، ۱۸۹۲/۶/۱۵ء، اوّل ۴

۵۰: سفر نامہ، ۱۱۵

تشریف لائیں، بہت خوشی سے ملوں گا'۔ تمام اَور بڑے پاشاؤں سے بھی ملاقات ہوسکتی ہے، لیکن اوّل زبان کی اجنبیت، ثانیاً مجھ کو اَور کسی کی ملاقات کا شوق بھی نہیں[۵۱]۔ دوسری دفعہ مَیں ملاقات کو گیا تو پہلے سے کمرے میں آ بیٹھے۔ مَیں اندر داخل ہوا تو کرسی سے اُٹھ کر دو ایک قدم بڑھے اور پہلے دِن کی طرح ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد مَیں جب ان سے ملا تو اسی طریقے سے ملے[۵۲]۔

....

یہاں کے کالج، عدالتیں، سیر گاہیں، علمی کارخانے سب دیکھے[۵۳]۔ تعلیم و تربیت کے معاملے میں جو چیز سب سے زیادہ قابلِ قدر اور قابلِ عزت ہے، وہ بورڈنگ سسٹم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترکی نہایت فخر سے اس بات کا دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس نے بورڈنگ کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، اس سے بہتر نہیں ہوسکتا۔ تمام بڑے بڑے کالجوں کے ساتھ بورڈنگ ہیں اور ان میں نہایت کثرت سے طلبہ رہتے ہیں، لیکن یہ التزام ہے کہ خوراک، لباس، وضع، مکان، فرنیچر تمام چیزیں ایک سی ہوں اور طالب علموں کی حالت میں فرقِ مراتب کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ بورڈنگ کا کرایہ اور خوراک کی جو فیس لی جاتی ہے، اس کے ساتھ کپڑوں کے دام بھی لیے جاتے ہیں اور طالب علموں کے کپڑے خود کالج کے اہتمام سے تیار ہوتے ہیں۔ تمام لڑکے میز اور کرسیوں پر کھاتے ہیں اور ہر چیز میں تکلف، صفائی، خوش سلیقگی کا نہایت اہتمام کیا جاتا ہے۔ ترکوں کی یہ عجیب قابلِ قدر فیاضی ہے کہ باوجود زیادتیِ فیس کے، غربا ان کالجوں کے فیض سے محروم نہیں ہیں۔ ہر کالج میں غریب طالب علموں کی معتدبہ تعداد ہے اور دولت مند ترکوں کی طرف سے ان کو اس قدر امداد دی جاتی ہے کہ وہ کالج کے تمام مصارف ادا کر سکتے ہیں۔ کالج کے احاطے میں جا کر کوئی شخص کسی طرح تمیز نہیں کر سکتا کہ فلاں طالب علم غریب اور کم مقدور ہے[۵۴]۔ بورڈنگ کا یہ طریقہ دیکھ کر مجھ کو اپنا

۵۱: بنام سرسید، ۱۵/۶/۱۸۹۲ء، اوّل ۴، ۵۲: سفرنامہ، ۱۱۵

۵۳: بنام سرسید، ۵ محرم الحرام ۱۳۱۰ھ، مکتوبات ۲۲، ۵۴: سفرنامہ، ۵۱

مدرسۃ العلوم [علی گڑھ] یاد آتا تھا اور مَیں اس کے بورڈنگ کے اختلافِ مراتب پر افسوس کرتا تھا، لیکن میرا افسوس درحقیقت مدرسۃ العلوم کی حالت پر نہ تھا، بلکہ قوم کے اُن بزرگوں پر تھا، جن کو خدا نے دولت اور مقدور دیا ہے، لیکن یہ توفیق نہیں دی کہ اپنی فیاضی سے اس بات کی کوشش کریں کہ ہماری تعلیم گاہ میں غربا اور اہلِ مقدرت ایک ہی بلند سطح پر نظر آئیں۔ مَیں علانیہ کہتا ہوں کہ ہمارے قومی کالج میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ تمام طالب علموں کا لباس، وضع، خوراک، مکان، فرنیچر کلیتہً ایک کر دیا جائے اور جو مختلف سطحیں آج کالج میں قائم ہیں، بالکل مٹا دی جائیں۔ اگر نہیں تو کالج میں قومیت کی رُوح نہیں[۵۵]۔

یہ کالج (مکتب حربیہ) بڑی عظمت و شان کا کالج ہے۔ اگرچہ قسطنطنیہ میں عام دستور ہے کہ سیکرٹری مدرسہ کی اجازت کے بغیر کوئی شخص کسی مدرسے کے احاطے میں داخل نہیں ہو سکتا، لیکن اس کالج میں اَور بھی زیادہ اہتمام اور روک ٹوک ہے۔ مَیں نے جب اس کی سیر کا قصد کیا تو لوگوں نے کہا کہ اس کے لیے خود سلطان کی اجازت درکار ہے۔ اگرچہ ممکن تھا کہ عثمان پاشا، جن سے اُس زمانے میں مجھ کو شرفِ ملاقات حاصل ہو چکا تھا، مجھ کو بہ آسانی اجازت دلاتے، لیکن مَیں نے اس کام کے لیے اُن کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا۔ مکتب حربیہ کے سیکرٹری ذکی پاشا ہیں، جو نہایت لائق اور اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ ہیں۔ مَیں نے خیال کیا کہ بغیر کسی واسطے کے خود اُن سے ملنا چاہیے۔ شیخ علی ظبیان نے بھی یہی رائے دی، چنانچہ ہم دونوں پاشائے موصوف کے مکان پر گئے۔ اتفاق سے وہ باہر جا چکے تھے۔ آدمی نے کہا، 'ذرا ٹھہر جایئے، شاید جلد آ جائیں'۔ اسی اثنا میں وہ آ پہنچے۔ گاڑی سے اُترنے کے ساتھ انھوں نے ہماری طرف رُخ کیا۔ شیخ علی ظبیان اور مَیں دونوں عربی لباس میں تھے۔ پاشائے موصوف کو اُس وقت نہایت جلدی تھی، سلام علیک کے ساتھ ہی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ مجیدیاں (ترکی سکہ) نکالیں۔ پہلے تو مجھ کو سخت تعجب ہوا، پھر یہ خیال آیا کہ نعوذ باللہ، انھوں نے ہم کو عام عربوں کی طرح گداگر سمجھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی مجھ کو نہایت رنج اور

۵۵: ایضاً، ۵۲

رنج کے ساتھ غصہ آیا۔ مَیں نے چلّا کر کہا، شو ھذا، ماجئنا لھذا، لسنا من الفقراء، یعنی 'یہ کیا ہے؟ ہم اس لیے نہیں آئے، ہم محتاج نہیں ہیں'۔ پاشائے موصوف اگرچہ عربی نہیں سمجھتے تھے، لیکن چہرے کی ہیئت اور لہجہ کلام سے سمجھے کہ یہ اَمر اس کو ناگوار گزرا۔ شیخ علی ظبیان کی طرف متوجہ ہوئے کہ 'یہ غیظ میں کیوں ہیں اور چاہتے کیا ہیں؟' شیخ علی ظبیان ٹوٹی پھوٹی ترکی بول لیتے تھے۔ میرے آنے کی غرض و غایت بیان کی۔ پاشائے موصوف نہایت شرمندہ ہوئے، معذرت کے ساتھ کہا کہ 'آپ بالا خانے پر چلیے، مَیں تھوڑی دیر میں آتا ہوں'۔ بالا خانے پر چند معزز عہدے دار جمع تھے، انھوں نے نہایت احترام کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ معمول کے موافق قہوہ آیا۔ ایک ایک سے مزاج پُرسی ہوئی۔ اُن لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ مَیں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور تحقیقاتِ علمی کی غرض سے یہاں آیا ہوں تو اس قدر گرویدہ ہوئے کہ ہر لفظ اور ہر ادا سے شوق اور محبت کا اظہار ہوتا تھا۔ نہایت افسوس تھا کہ مَیں نہ ترکی سمجھتا تھا، نہ فرنچ اور وہ اِن زبانوں کے سوا اَور کسی زبان میں گفتگو نہ کر سکتے تھے۔ اُٹھ اُٹھ کر میرے پاس آ بیٹھتے تھے اور اظہارِ محبت کے ساتھ افسوس ظاہر کرتے تھے کہ ہم آپ کی زبان نہیں سمجھتے۔ تھوڑی دیر کے بعد ذکی پاشا نے معذرت کے ساتھ کہلا بھیجا کہ مجھ کو ضروری کام درپیش ہیں، اس لیے مَیں خود نہیں آ سکتا، لیکن مَیں نے ایک افسر کو حکم دے دیا ہے، وہ آپ کو اچھی طرح کالج کی سیر کرا دے گا۔ پاشائے موصوف کی معذرت اگرچہ بہانہ پر محمول نہیں ہو سکتی تھی، واقعی ان کو بہت سے محکمے سپرد ہیں اور تمام تمام دِن ان کو دَورے میں گزرتا ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کو اپنی حرکت پر سخت ندامت ہوئی تھی اور یہ بھی اُن کے نہ آنے کا ایک سبب تھا۔[۵۶]

مَیں نے [مکتب ملکیہ] کالج کی [بھی] اچھی طرح سیر کی۔ کالج کے مینیجر، جو ایک معزز ترک ہیں، اگرچہ عربی نہیں سمجھتے، لیکن چونکہ ترجمان میرے ساتھ تھا، بے تکلف گفتگو ہو سکتی تھی۔ یہاں کے کالجوں میں مَیں نے یہ بات عموماً دیکھی اور مجھ کو بہت پسند آئی کہ مینیجر

۵۶: ایضاً، ۵۶-۵۷

معزز زُتبے کا آدمی ہوتا ہے اور اس کی طرز معاشرت سے عزت و شان ظاہر ہوتی ہے۔ مَیں جس وقت کالج میں پہنچا، چھٹی کا گھنٹہ تھا اور لڑکے کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب لڑکے کلاسوں میں آ گئے تو مینیجر نے مجھ کو کالج کے تمام کمروں کی سیر کرائی۔ کھانے کا کمرہ نہایت خوش سلیقگی سے مرتب تھا۔ اسی سلسلہ عمارت میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے، اس کی عمارت چنداں قابلِ ذکر نہیں، لیکن خوب صورت اور مزیّن معلوم ہوتی تھی۔ اسی اثنا میں ظہر کا وقت آ گیا۔ مسلمان لڑکوں نے نماز کی تیاری کی۔ وہ عموماً کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے اور اس لباس میں ان کا ادب اور متانت کے ساتھ وضو کرنا اور وقار و احترام کے ساتھ قطار در قطار مسجد کو جانا میرے دل میں عجیب اثر کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر مذہبی اثر سے آزاد ہو کر ترقی کریں تو ایسی ترقی سے تنزل ہزار درجے بہتر ہے[۵۷]۔

....

مَیں [وطن سے] خطوط کے نہ آنے سے نہایت پریشان اور دل شکستہ تھا، عین اس حالت میں [سرسید کے] نامۂ والا نے گویا مسیحائی کی۔ یہاں ڈاک کا عجب نظام ہے، انگریزی ڈاک کا محکمہ جدا ہے۔ جو خطوط ہندوستان وغیرہ سے آتے ہیں، وہ اس محکمہ میں جاتے ہیں اور وہاں سے تقسیم نہیں ہوتے، بلکہ مکتوب الیہ کو خود جا کر لانا چاہیے[۵۸]۔ مَیں جانتا ہوں کہ میرے احباب مجھ کو بھول گئے، لیکن [سرسید کے خط میں] محبی خوشی محمد ناظر کے ضمنی تذکرے نے میرے دل میں ایک عجیب رِقت انگیز اثر پیدا کیا۔ ہاں، مَیں نادم ہوں کہ مَیں نے کسی تحریر [خط] میں محبی و مخلصی مولوی سید ممتاز علی صاحب کے حالات نہیں پوچھے۔ حقیقت میں اس سے زیادہ بدعہدی اور بے وفائی نہیں ہو سکتی۔ مَیں نے والد قبلہ کو دو خط لکھے، لیکن وہاں سے کوئی تحریر نہیں آئی۔ انھوں نے کچھ روپے بھیجے، مجھ کو اس وقت روپے کی ضرورت نہیں۔ مَیں نے ان کی خدمت کبھی نہیں کی، ان کو کم از کم تکلیف تو نہ دُوں[۵۹]۔

....

۵۷: ایضاً، ۶۵-۶۶

۵۸: بنام سرسید، ۵ر محرم الحرام ۱۳۱۰ھ، مکتوبات، ۲۳-۲۴

۵۹: ایضاً، ۲۵

جو اثر اس سفر [ترکی] سے میرے دل پر ہوا، وہ ہزاروں کتابوں کے مطالعے سے نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھ کو معلوم ہوا کہ انسان جب تک دنیا کے بڑے بڑے حصے نہ دیکھے، انسان نہیں ہو سکتا۔[۶۰]

مسلمانوں کی حالت وہاں [ترکی میں] بھی کچھ زیادہ مسرت اور اطمینان کے قابل نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بہت سی باتوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے قریب قریب ہے۔ صنعت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں، تجارت میں ان کا بہت کم حصہ ہے، معمولی دُکاندار تک یہودی یا عیسائی ہیں۔ پرانی تعلیم نہایت بہتر ہے اور ہوتی جاتی ہے؛ نئی تعلیم کے متعلق جو شکایت یہاں ہے، وہاں بھی ہے۔ پرانی تہذیب اور نئی تہذیب میں ابھی تک رقابت ہے اور دونوں سے مل کر کوئی مرکب مزاج پیدا نہیں ہوا۔ پرانے خیال والے ابھی تک زمانے کی رفتار سے بے خبر ہیں، نئے مذاق کے لوگ جس قدر کہتے ہیں، کرتے نہیں۔ ہمت، غیرت، جوش، عزم، استقلال کے بجائے کُل قوم پر (من حیث الاغلب) افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ جو شخص جس حال میں ہے، اُسی پر قانع ہے۔ موجودہ حالت تو یہ ہے:
لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا [۶۵:۱]۔[۶۱]

تعلیم یافتہ گروہ میں ابھی تک وہ زندہ دلی، آزاد خیالی، حوصلہ مندی، بلند نظری نہیں پیدا ہوئی، جو نئی تعلیم کا لازمہ ہے؛[۶۲] اس سے بڑھ کے افسوس یہ ہے کہ تمام کالج اسکول حکومت کی طرف سے ہیں۔ قوم نے ابھی تک اس کی طرف توجہ نہیں کی ہے، یعنی اتنے بڑے دارالسلطنت میں ایک بھی قومی کالج نہیں۔ کوئی گورنمنٹ کتنی ہی مقتدر اور دولت مند ہو، لیکن تمام ملک کی علمی ضرورتوں کی کفیل نہیں ہو سکتی۔ اگر ہو بھی تو چنداں مفید نہیں۔ جس قوم کی تمام ضرورتیں گورنمنٹ انجام دیا کرتی ہے، اس کی دِماغی قوتیں مردہ اور بے کار ہو جاتی ہیں۔[۶۳]

افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقہ تعلیم تھا، اس

۶۰: بنام حبیب اللہ، ۱۸۹۲/۶/۵ء، اول ۱۳۰ — ۶۱: سفر نامہ، ۱۲
۶۲: ایضاً، ۵۴ — ۶۳: ایضاً، ۵۵

میں یورپ کا ذرا بھی پرتو نہیں۔ جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے، لیکن دونوں کے حدود جُدا رکھے گئے ہیں اور جب تک یہ دونوں ڈانڈے نہ ملیں گے، اصلی ترقی نہ ہو سکے گی۔ یہی کمی تو ہمارے ملک میں ہے، جس کا رونا ہے۔[۶۴]

اس دُور دراز سفر سے کتب خانوں کی سیر کے علاوہ اگر میرا کچھ اَور مقصد ہو سکتا تھا تو یہاں کی طرزِ تعلیم اور ترقیِ تعلیم کا اندازہ کرنا تھا، چنانچہ مَیں نے اس پر بہ نسبت اَور تمام باتوں کے زیادہ توجہ کی اور جہاں تک ہو سکا، کوشش اور محنت کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، لیکن یہ اُمید نہیں کرنی چاہیے کہ مَیں اپنے مقاصد میں پورا کامیاب بھی ہوا۔ چند بار سررشتہ تعلیم کے دفتر میں گیا، افسرانِ تعلیم سے تحقیق طلب باتیں دریافت کیں، بڑے بڑے کالج اور اسکول خود جا کر دیکھے، ٹیچروں اور پروفیسروں سے ملا، کالجوں کی سالانہ رپورٹیں حاصل کیں؛ لیکن ان تمام کوششوں پر بھی پوری کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ترکوں میں یہ عجیب دستور ہے کہ وہ ہر بات کو پالیٹکس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس وجہ سے کسی معاملے کا منظر عام میں آنا پسند نہیں کرتے۔ سررشتہ تعلیم کی رپورٹ، جو سالنامہ کے ساتھ شائع ہوتی ہے، نہایت مختصر اور محض مجمل ہوتی ہے، یہاں تک کہ مصارفِ تعلیم اور پروفیسروں اور ٹیچروں کی تنخواہوں کا ذکر تک نہیں ہوتا۔ بعض بعض کالجوں، مثلاً مکتب حربیہ و مکتب سلطانی کی جداگانہ رپورٹیں شائع ہوتی ہیں، لیکن ان میں نتائجِ امتحان اور نصابِ تعلیم کے سوا اَور کچھ نہیں ہوتا۔ اوّل اوّل مجھ کو خیال ہوا کہ چونکہ میری رسائی کے وسیلے کم تھے، اس لیے یہ حالات کم معلوم ہو سکے، لیکن جب مَیں نے خیر الدین پاشا وزیر ٹونس کی کتاب پڑھی تو تسکین ہو گئی۔ اس نے جہاں ترکی کا ذکر کیا ہے اور اس کی تمدنی و تعلیمی ترقیوں کا حال لکھا ہے، نہایت اجمال سے کام لیا ہے اور یہ معذرت کی ہے کہ "مَیں نے ترکی کے جو حالات لکھے، وہ انگریزی کتابوں کے ذریعے سے لکھے اور اس وجہ سے مفصل نہ لکھ سکا، لیکن مسلمانوں کی تحریرات میں اس قدر بھی نہیں مل سکتا"۔[۶۵]

۶۴: بنام سرسید، ۱۸۹۲/۶/۱۵ء، اوّل، ۴

۶۵: سفرنامہ، ۴۵

سلطان کو تعلیم کے ساتھ عجیب دلچسپی ہے۔ مکتب ملکیہ اور مکتب الحقوق، قسطنطنیہ کے نامور کالج ہیں، خاص سلطان کے قائم کردہ ہیں۔ حضرتِ ممدوح کو ان کالجوں کی طرف یہ التفات ہے کہ چند بار بنفس نفیس اُن کے معائنے کو تشریف لا چکے ہیں۔ جس زمانے میں مَیں قسطنطنیہ میں تھا، حضرتِ ممدوح نے تمام بڑے بڑے کالجوں کے طالب علموں کی شاہانہ دعوت کی۔ قسطنطنیہ میں کاغذ خانہ ایک مشہور سیر گاہ ہے، جہاں ہفتہ میں ایک بار تماشائیوں کا مجمع ہوتا ہے۔ یہ مقام دعوت کے لیے تجویز کیا گیا اور حکم ہوا کہ ہر کالج کے لڑکے باری باری وہاں بلائے جائیں۔ طالب علم کالج سے چلتے تھے تو سلطان کے حکم کے موافق شاہی بینڈ اُن کے آگے آگے بجتا جاتا تھا۔ چونکہ مصالح ملکی کی وجہ سے سلطان خود ان جلسوں میں شریک نہیں ہو سکتے تھے، ہمیشہ ان کی طرف سے ایک وزیر شریکِ دعوت ہوتا تھا اور طالب العلموں کو سلطان کا سلام پہنچاتا تھا۔ اُس وقت تمام طالب العلم بڑے جوش اور اخلاص سے 'بادشاہم چق یشا' کا نعرہ بلند کرتے۔[۶۶]

....

مَیں درویش پاشا کے مکان پر گیا۔ وہاں چند اَور بزرگ تشریف رکھتے تھے، سب سے تعارُف ہوا اور دیر تک صحبت رہی۔ چونکہ اس وقت تک مَیں نے ترکی بوٹ کا استعمال نہیں شروع کیا تھا اور انگریزی بوٹ پہن کر مکان کے اندر جانا یہاں معیوب ہے، مَیں نے دروازے ہی پر بوٹ اُتار دیا تھا۔ ترکوں کے نزدیک بوٹ کا پاؤں میں نہ ہونا بدسلیقگی میں داخل ہے، اس لیے کسی کسی کو خیال ہوا۔ حاضرین میں سے ایک بزرگ [کاظم آفندی]، جو اسکول کے ماسٹر اور معزز آدمی تھے، چپکے سے اُٹھے اور ایک سلیپر لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔[۶۷]

ترکوں کی تہذیب و ترقی میں جو چیز سب سے زیادہ قابلِ قدر اور قابلِ تقلید ہے، وہ عورتوں کی تعلیم و تربیت و طریقۂ معاشرت ہے۔[۶۸] لڑکیوں کی تعلیم کے لیے سرکاری اور خانگی

۶۶: ایضاً، ۴۷-۴۸

۶۷: ایضاً، ۱۰۴

۶۸: ایضاً، ۱۰۸

مدرسے کثرت سے ہیں اور پردہ وحفاظت کا ایسا عمدہ انتظام ہے کہ شرفا کو اپنی لڑکیوں کے بھیجنے میں کچھ تامل نہیں ہوتا۔ ان مدارس کی وجہ سے تعلیم اس قدر عام ہو گئی ہے کہ زمانہ حال میں بمشکل ایسی عورت مل سکتی ہے، جس نے مناسب درجے تک تعلیم نہ پائی ہو۔ عورتوں کو چلنے پھرنے میں عام آزادی حاصل ہے۔ لباس بالکل یورپین ہے، لیکن جب باہر نکلتی ہیں تو نہایت ڈھیلا ڈھالا ریشمی گون پہن لیتی ہیں، جو گردن سے لے کر پاؤں تک ہوتا ہے اور اوپر سے نیچے تک بٹن لگے ہوتے ہیں، اس سے بجز چہرے کے اَور تمام جسم اس طرح ڈھک جاتا ہے کہ بدن کی ہیئت تک نہیں معلوم ہوتی۔[69] ایک دفعہ مَیں عاشر آفندی کے کتب خانے میں بیٹھا ہوا تھا، ایک ترک صاحب بھی تشریف رکھتے تھے، جن سے میری جان پہچان ہو گئی تھی۔ اتفاق سے وہیں اُن کی دونو جوان لڑکیاں، جن میں سے ایک کی شادی ہو چکی تھی، اُن سے ملنے کے لیے آئیں۔ انھوں نے مجھ کو دونوں سے انٹروڈیوس کرایا۔ جس احترام اور متانت وشرم سے وہ معصوم خاتونیں میرے سامنے کھڑی تھیں، مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ عورتیں نہیں، بلکہ عفت وعصمت کی دیبیاں [دیویاں] ہیں۔[70]

....

آج [۱۵ر جون] مَیں حسین حبیب آفندی سے، جو بمبئی میں سفیر تھے اور اب یہاں پولیس جنرل [کمشنر] ہیں، ملا۔[71] بدرالدین طیب جی بیرسٹرایٹ لا ساکن بمبئی کے عموزاد بھائی ہیں، ہندوستانی اشیا کی تجارت کرتے ہیں۔ پہلے ان کا کارخانہ بڑے فروغ پر تھا، چنانچہ اَور مصارف کے علاوہ آٹھ سو ماہوار صرف دُکان کا کرایہ تھا، لیکن اب فیشن کے بدل جانے سے ان چیزوں کی قدر نہیں رہی اور کارخانہ سست ہو گیا؛ تاہم خوش حالی سے بسر کرتے ہیں، مکان اور فرنیچر قسطنطنیہ کے لحاظ سے امیرانہ ہے۔ ایک باغ بھی تیار کرایا ہے۔ تمام لوگ اُن کی عزت کرتے ہیں، سلطان کے یہاں سے میڈل بھی ملا ہے۔

۶۹: ایضاً، ۱۰۹ ۔ ۷۰: ایضاً، ۱۱۰

۷۱: بنام سرسید، ۱۸۹۲/۶/۱۵ء، اوّل ۵،

انگریزی بخوبی جانتے ہیں؛ نہایت خوش اخلاق، فیاض، روشن ضمیر، نیک طبع آدمی ہیں۔ ہندوستانیوں سے ان کو عجب اُنس اور محبت ہے اور یہ حب الوطنی ہی میری اوران کی تعارُف کا ذریعہ ہوئی۔ ایک دفعہ مَیں بازار میں پھر رہا تھا، آفندی موصوف سامنے سے گزرے۔ مجھ کو دیکھ کر بے اختیار بڑھ کر پوچھا، 'آپ ہندوستانی تو نہیں؟'۔ اس وقت میرا لباس عربی تھا، طرہ یہ کہ جواب میں اتفاقاً سے بجائے 'ہاں' کے 'نعم' کا لفظ نکلا؛ تاہم میرا ہندی ہونا کیونکر چھپ سکتا تھا، وہ گلے سے لپٹ گئے اور بولے کہ 'آپ تو ہماری چیز ہیں، ہم سے بچ کر کہاں چلے تھے'[۷۲]۔ اس لطف و مہربانی سے پیش آئے کہ مَیں بیان نہیں کر سکتا۔ اصرار کر کے کھانا کھلایا، کوٹھی اور پائیں باغ کی سیر کرائی، پردہ کرا کر زنانہ مکان کے تمام کمرے دِکھائے۔ رُخصت ہونے لگا تو فرمایا کہ مجھ کو بھی کچہری جانا ہے، ساتھ ہی چلیں گے، چنانچہ اپنی گاڑی میں بٹھا کر دُور تک ساتھ لائے[۷۳]۔ جب تک وہاں رہا، اکثر میرے مکان پر تشریف لاتے تھے۔ کئی دفعہ دعوت کی اور اپنے گھر لے گئے[۷۴]۔ وہ اردو بخوبی بولتے ہیں۔ سیرت النعمان کا ایک نسخہ ان کو ہدیہ دوں گا، وہ اسی مذاق کے آدمی ہیں[۷۵]۔ ان کے اخلاق نے مجھ کو نہایت گراں بار کر دیا ہے اور مَیں کسی قدر سبک دوش ہونا چاہتا ہوں، نظام آباد کے برتن [یا] لکھنؤ کی چکن کا ایک تھان [یا] مراد آباد کا کوئی برتن؛ غرض کوئی نادر چیز [ان کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔][۷۶]

....

فواد بک مکتب ملکیہ کے ایک ممتاز طالب علم ہیں۔ دمشق کے قریب حسبایا ایک موضع ہے، جہاں حضرت خالد بن الولید کی نسل سے ایک خاندان آباد ہے۔ یہ لوگ دولت مند ہیں اوراس کے ساتھ ملکی اثر رکھتے ہیں، چنانچہ ترکی حکومت کی طرف سے اب تک ان اضلاع کا جو حاکم مقرر ہوتا تھا، اسی خاندان سے انتخاب کیا جاتا تھا۔ فواد سے میری ملاقات عزیزانہ

۷۲: سفرنامہ، ۱۱۱
۷۳: ایضاً، ۱۰۵
۷۴: ایضاً، ۱۱۱
۷۵: بنام سرسید، ۱۵/۶/۱۸۹۲، اوّل، ۵
۷۶: بنام حبیب اللہ، ۱۵/۶/۱۸۹۲، اوّل، ۱۵

تعلق کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ ان کے ایک بھائی سامی بک اُنھی دِنوں قسطنطنیہ آئے اور مَیں نے جو مکان کرایے پر لیا تھا، اسی کے ایک کمرے میں فروکش ہوئے۔ وہ مکتب الحقوق میں داخل ہونے کی تیاری کرتے تھے اور چونکہ امتحانِ داخلہ میں منطق کا بھی امتحان ہوتا ہے، مجھ سے درخواست کی کہ مَیں مختصر طور پر اُن کو منطق کے تمام مسائل پر عبور کرادوں۔ اگرچہ میرا حرجِ اوقات ہوتا تھا، تاہم ان کی خاطر سے مَیں نے اُن کو اور ان کے ساتھ دو تین اَور طالب علموں کو [منطق پر فرفریوس کی کتاب] ایساغوجی پڑھائی۔ حسن اتفاق یہ کہ امتحانِ داخلہ میں وہ لوگ پاس بھی ہو گئے۔ اس طرح دوستی اور محبت کا رشتہ اَور بھی مضبوط ہو گیا۔ شام کو ہمیشہ ہم تین چار آدمی ایک قہوہ خانے میں، جو عین لبِ دریا ہے، ساتھ بیٹھا کرتے تھے اور عجب لطف و مزے کی صحبت رہتی تھی۔ کبھی کبھی مغرب کے بعد کشتی کرایہ کرتے اور سمندر کی سیر کرتے پھرتے۔ فواد کو گانا آتا تھا، مزے میں آ کر عربی گیت گایا کرتے۔ ایک دِن مجھ سے فرمائش کی کہ کوئی ہندی چیز سناؤ۔ مَیں نے بہتیرا کہا کہ 'بھائی! مَیں مولوی آدمی ہوں، مجھ کو گانے سے کیا واسطہ؟' لیکن وہ کب مانتے تھے۔ آخر مجبور ہو کر مَیں نے اردو کے دو تین شعر آواز کو گھٹا بڑھا کر پڑھے اور کہا کہ ہندی میں یوں ہی گاتے ہیں[۷۷]۔

قہوہ خانے نہایت کثرت سے ہیں، میرے تخمینے میں چار پانچ ہزار سے کم نہ ہوں گے۔ بعض نہایت عظیم الشان ہیں، جن کی عمارتیں شاہی محل معلوم ہوتی ہیں۔ قہوہ خانوں میں ہمیشہ ہر قسم کے شربت اور چائے و قہوہ وغیرہ مہیا رہتا ہے۔ قسطنطنیہ، بلکہ ان تمام ممالک میں قہوہ خانے ضروریاتِ زندگی میں محسوب ہیں۔ میرے عرب احباب جب مجھ سے سنتے تھے کہ ہندوستان میں اس کا رواج نہیں تو تعجب سے کہتے تھے، بالیش یتسلون، یعنی وہاں لوگ جی کیونکر بہلاتے ہیں۔ ان ملکوں میں دوستوں کے ملنے جلنے اور گرمیِ صحبت کے موقعے یہی قہوہ خانے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہندوستانیوں کو اِن باتوں کا ذوق نہیں۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ اس قسم کی عام صحبتیں زندگی کی دلچسپی کے لیے کس قدر ضروری ہیں اور

۷۷: سفرنامہ، ۱۱۲-۱۱۳

طبیعت کی شگفتگی پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے۔[۷۸]

قسطنطنیہ کی آب وہوا کی عمدگی اس قابل ہے کہ انسان اپنی عمر کا ایک حصہ ضرور اس کی نذر کرے۔ اگر مَیں پرہیز کرسکتا تو موسم کی عمدگی سے بہت فائدہ اٹھاتا اور خوب موٹا تازہ ہو کر آتا، لیکن یہاں کے لذیذ میوے، جو لذت کے ساتھ کم بخت نہایت ارزاں بھی ہیں، کسی طرح مجھ جیسے شخص کو اعتدال کی حد پر نہیں رہنے دیتے۔[۷۹]

....

آج مَیں نے 'عجیب دل آویز' خواب دیکھا ہے، 'عجیب' اس لیے کہ دوپہر کا وقت تھا اور آنکھیں بیدار تھیں اور 'دل آویزی' کی یہ کیفیت ہے کہ جاگے ہوئے مدت ہو چکی ہے اور اب تک آنکھوں میں وہی سماں پھر رہا ہے...... آج [۱۹؍جون] جمعہ کا دن تھا اور معمول کے موافق موکب سلطانی کا نظارہ گاہ تھا، مَیں بھی ہمہ تن شوق بن کر گیا۔ جامع حمیدیہ میں داخل ہوا، سلطان المعظم بڑی شوکت وشان سے آئے، لیکن مَیں کچھ دیکھ نہ سکا، کیونکہ یہ سیر صرف ان لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے، جو گزرگاہِ سلطانی پر پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور پھر نماز کے ختم ہونے تک جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے۔ محل سلطانی سے تھوڑی دُور کے فاصلے پر ایک نہایت پُر تکلف جامع مسجد ہے، جو سلطان کے نام سے حمیدیہ مشہور ہے۔ اس گزرگاہ میں ایک مکان ہے اور دُور دُور ملکوں سے آئے ہوئے معزز سیاح یا عہدے دار، جو موکبِ ہمایونی کی سیر کرنا چاہتے ہیں، وہ کسی معزز شخص کے ذریعے سے اجازت حاصل کرتے ہیں اور اس مکان کی چھت پر بیٹھ کر یہ تماشا دیکھتے ہیں۔ اس کے سوا اَور کوئی تدبیر نہیں ہے، کیونکہ سواری کے وقت دُور تک چاروں طرف فوج کا دائرہ ہوتا ہے اور کوئی شخص اس کے اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ حسین حبیب آفندی نے مجھ کو اجازت دلانے کا وعدہ کیا تھا، مگر اتفاق سے وہ دیر میں آئے۔ اِدھر سواری کا وقت قریب آیا اور 'طرقوا' اور 'دُورباش' کی صدائیں بلند ہونے لگیں، مجبوراً مَیں مسجد میں داخل ہوا اور صفِ اوّل میں جا کر بیٹھا۔ سلطان کی گاڑی زینہ تک آتی

۷۸: ایضاً، ۴۰

۷۹: بنام سرسید، ۵؍محرم الحرام ۱۳۱۰ھ، مکتوبات، ۲۴

ہے اور وہ اُتر کر فوراً مسجد کے بالائی حصے پر، جہاں نہایت مقرب اور مخصوص لوگوں کے سوا کوئی نہیں جا سکتا، تشریف لے جاتے ہیں۔ وہاں ایک مقصورہ ہے، جس کا دروازہ منبر کے بائیں طرف ہے۔ یہ سلطان کی نماز کی جگہ ہے۔ جب سلطان تشریف لاتے ہیں تو اطلسی پردے چھوڑ دیے جاتے ہیں اور کوئی شخص ان کو دیکھ نہیں سکتا۔ خطیب نے جب سلطان کے مقصورہ کی طرف نگاہ اٹھا کر بڑے جوش سے کہا کہ اللّٰھم انصر مولانا السلطان السلطان الغازی عبدالحمید خاں تو میرے بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے اور دیر تک دل کا یہ حال رہا کہ اُنڈا چلا آتا تھا۔ خطیب نے پہلے صحابہ کا نام پڑھا اور سلطان کا نام آیا تو ایک زینہ اتر آیا کہ ظاہر ہو کہ سلطان اگرچہ آج ظل اللہ ہیں، تاہم ان کا رُتبہ حضرت صدیقؓ وحضرت عمرؓ سے کچھ نسبت نہیں رکھتا۔ نماز کے بعد حسین آفندی نے اتفاقاً مجھ کو دیکھ لیا اور مسجد کے صحن میں، جہاں پاشا اور سرداران فوج حلقہ باندھے کھڑے تھے، لے جا کر کھڑا کر دیا اور لوگوں سے کہہ دیا کہ ان سے کوئی تعرض نہ کرے۔ سلطان مقصورہ سے اتر کر زینہ کے قریب پردے کے اوٹ میں بیٹھے اور فوجیں سامنے سے گزرنی شروع ہوئیں، دو گھنٹے کامل ایک عجیب تماشا نظر آتا رہا۔ قریباً دس ہزار فوج تھی۔ مختلف رسالے اور ہر رسالے کے تمام ساز و اسلحہ جدا جدا تھے۔ مَیں کیا کہوں، ترکی جوانوں کی دلیرانہ مورتیں، چمکتے ہوئے اسلحے، موزوں اور باقاعدہ رفتار، گھوڑوں کی جست وخیز، پاشاؤں کا زرکار لباس، جگمگاتے ہوئے تمغے، عجیب سماں تھا، جو کسی طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اخیر میں دونوں شہزادے آئے، بڑے کی عمر نو دس برس کی تھی، لیکن جس شان وشوکت سے وہ گھوڑے پر سوار تھا، بڑے بڑے دلیروں کے وہ تیور نہیں ہو سکتے۔ فوجیں گزر چکیں تو سلطان گاڑی پر سوار ہوئے اور ہمارے سامنے سے گزرے۔ سواری مقابل آئی تو تمام حلقہ نے رکوع کے قریب جھک کر سلام کیا۔ سلطان دونوں ہاتھوں سے ان کا جواب دیتے تھے۔ یورپ کے اکثر معزز اشخاص یہ تماشا دیکھنے آئے تھے، حالانکہ یہ معمولی چیز ہے اور ہر جمعے کو ہوتی ہے۔[۸۰]

۸۰: بنام حبیب اللہ، ۱۸۹۲/۶/۱۹ء، اوّل، ۱۵-۱۷

ترکوں میں سلاملق کا طریقہ ایک مدت سے چلا آتا ہے اور رسومِ سلطنت کا ایک جزو بن گیا ہے۔ اس سے فقط شاہانہ جاہ وجلال کا اظہار مقصود نہیں ہے، بلکہ بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر ہفتے فوج کے ایک بڑے حصے کا جائزہ ہو جاتا ہے اور اس طرح کُل فوجیں، جو پایۂ تخت اور اس کے اطراف میں رہتی ہیں، سال میں چند بار ملاحظہ سلطانی سے گزر جاتی ہیں۔ سلطانِ وقت فوج کی حالت کا کافی اندازہ کرسکتا ہے اور فوج کے دل میں بادشاہ کی طرف سے جوش اور وفاداری کے خیالات تازہ ہو جاتے ہیں۔[۸۱]

یہ تماشا دیکھ کر قیام گاہ پر واپس آیا تو دِل جوش اور اثر سے معمور تھا۔ شاعرانہ جذبات کی تحریک سے خود بخود جستہ جستہ مصرعے زبان پر آتے جاتے تھے، قلم و کاغذ لے کر بیٹھا اور کچھ اشعار قلم بند کیے، پھر خیال آیا کہ عید کے دِن اس سے بھی بڑھ کر سامان ہوگا، اس کو بھی دیکھ لوں تو لکھوں۔[۸۲]

عید کے دِن سلاملق نہ تھی اور اس وجہ سے فوج کی تعداد کم تھی، لیکن شان وشوکت، جاہ وجلال، جوش واثر سلاملق سے بھی کچھ بڑھ کر تھا۔ قریباً آٹھ بجے فوجوں کی آمد شروع ہوئی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک تانتا بندھا رہا۔ اُس کے بعد بہت سی خالی گاڑیاں آئیں۔ لوگوں کو تعجب تھا کہ ان سے کیا مقصد ہے؟ یکا یک دُور سے پیادہ صفیں نمودار ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ تمام وزرا، پاشا، افسرانِ فوج اور بڑے بڑے عہدے دارانِ ملکی سلطان کے جلوس میں پیادہ پا آرہے ہیں۔ یہ صفیں سڑک کے دونوں جانب متصل آدھ میل تک تھیں اور ان کی وضع اور لباس سے عجیب شان وشوکت کا اظہار ہوتا تھا۔ شانوں پر زرّیں پھول، دامن اور آستینوں پر کلابتوں کی تحریر، سینے مرصع اور طلائی تمغوں سے ڈھکے ہوئے؛ ان سب پر آفتاب کا عکس، تمام میدان جگمگا اٹھا۔ یہ صف جا چکی تو سلطان کا جمالِ جہاں آرا نظر آیا۔ جنابِ ممدوح گھوڑے پر سوار تھے، لباس بالکل سادہ تھا، چند بڑے بڑے نامور فوجی افسر رکاب میں تھے، گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا تھا اور ہر قدم پر اس زور سے بادشاہم چوق یشا (زندہ باد)

۸۱: سفرنامہ، ۹۸ ۸۲: ایضاً

کا نعرہ بلند ہوتا تھا کہ تمام میدان گونج اٹھتا تھا۔[۸۳]

مَیں یہ سماں دیکھ کر واپس آیا تو قلم دوات لے کر بیٹھا کہ جو کچھ خود دیکھا ہے، دوسروں کو بھی دِکھا سکوں، لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ قلم نے بالکل کوتاہی کی۔ جو تصویر مَیں نے [مثنویِ عیدیہ میں] کھینچی ہے، وہ بالکل نامکمل تصویر ہے:[۸۴]

قاصد فرخندۂ من ہاں تعال متّعک اللّٰہ بحسن المآل

پیش رسیدت سفرے ناگزیر گرم ز جا خیز و رہ ہند گیر

زود رو و فکرِ دو عالم مکن ور نفسی راست کنی ، ہم مکن

دیدہ براہ اند عزیزانِ ہند جملہ گرامی گہر کانِ ہند

چوں تو دراں بزم کشی زمزمہ دائرہ گردند بگردت ہمہ

تا ز حدیثِ تو شود بہرہ مند ہر یکے از جائے جہد چوں سپند

جملہ بدیں حرف کہ اے نیک خوے حرفے ازاں یار سفر کردہ گوے

تا بچہ حال ست و چساں ست وخود رفت چہا بر سرش از نیک و بد

بر روش دیدہ وراں میزید یا کہ چو بہماں و فلاں میزید

آر پس ایں محنت و رنج شگرف از سفر روم چہ بُر دشت طرف

بزمِ خوشی بود تماشا چہ کرد کار بسے بود ازانہا چہ کرد

در صفِ دانش طلباں چوں نشست زاں چمن تازہ بدامن چہ بست

طے چو شود مرحلۂ پرس و جوے از من آوارہ بیاراں بگوے

کاے ہمہ گنجینہ کشایاں فن صدر نشیناں سرخواں فن

از کرم داور بالا و پست حال من آں گونہ کہ بایست ہست

ہم بہماں طرز و روش میزیم زندہ ام و فارغ و خوش میزیم

گرچہ خودم با سر و سامانِ نیم نازکش حاجب و دربان نیم

۸۳: ایضاً، ۹۸-۹۹

۸۴: ایضاً، ۹۹

نیست سرِ انجمن آرائیے | ایں منم گوشۂ تنہائیے
ویں کہ بہ پرسید کہ زاں جلوہ گاہ | تاچہ بود حاصلِ چشم و نگاہ
ہی چہ تواں گفت کہ ذوقِ سخن | ہر نفسم مے برد از خویشتن
گرچہ نخواہم کہ نشینم خموش | فرصت آں کو کہ بیایم بہوش
گرچہ بعرضِ سخن آمادہ ام | مست ز کیفیتِ ایں بادہ ام
بگذر ازیں حرف و مکرر مپرس | خوابِ خوشے دیدم و دیگر مپرس
خوانِ سخن گر نہ خود آراستم | عذر بنہ محوِ تماشاستم
تند مے بود خرابم ہنوز | دیدہ من باز و بخوابم ہنوز
با تو چگویم کہ چہا دیدہ ام | شعبدہ ہا پیشِ نظر چیدہ ام

بزم چو از جلوۂ زیبا پُر است
دامنِ چشمم ز تماشا پُر است

مہر چو از جیبِ افق سرکشید | خاست زہر ناحیہ گلبانگ عید
دیدہ پُر از خواب چو برخاستند | پیر و جواں جملہ تن آراستند
طفل کہ ایں شیوہ نداند درست | مادرش از مہر تن وردیِ شست
شیوہ و آئین طرب تازہ گشت | کوچہ و بازار پر آوازہ گشت
مژدہ رسید ایں کہ شہ چارہ ساز | زود بر آید باداے نماز
تا برد از خوانِ کرم توشۂ | خلق بروں ریخت زہر گوشۂ
بسکہ عنانِ طلب انگیختند | طفل و جواں برسرہم ریختند
پیکِ نظر راہ تماشا نیافت | نقشِ قدم ہم بہ زمیں جا نیافت
جملہ بصد شوق و بصد آرزوے | سوے بشکطاش نہادند روے
سرمہ خاکِ رہ شہ خواستند | جا بگذرگاہِ سپہ خواستند
از دو سوے راہ بکسب شرف | خلق بآئینِ ادب بست صف

مہر چو در ہر جہت افشاند نور
کوکبۂ شاہ عیاں شد ز دور

گشتِ رواں از پی ہم خیل و فوج
موج تو گوئی کہ شکستی بموج

بود شعار ہمہ از ہم جدا
ہر ہمہ را رایت و پرچم جدا

پرتو آں اسلحۂ تابناک
نور ہمی ریخت بدامانِ خاک

با ہمہ تمکین چو گذشت ایں گروہ
گشت بہ یکبار زمین پُرشکوہ

غلغلہ برخاست کہ بادا نوید
مہر جہانتابِ خلافت دمید

داغ نہ جبہۂ خورشید و ماہ
حضرتِ خاقان خلافت پناہ

قاعدۂ دولت و دیں را مدار
آئینۂ رحمتِ پروردِگار

پیکرِ لطف و کرمِ کبریاے
سایۂ یزداں شہِ کشورکشاے

خسروِ لشکر شکن و قلعہ گیر
شاہ فلک عتبہ و گردوں سریر

فاتحہ دولت و طغراے دین
زیب دہ افسر و تاج و نگین

شاہ فلک کوکبۂ عبدالحمید
ایدہ اللّٰہ بنصرٍ مزید

فرۂ شاہی ز جبین آشکار
حاشیہ بوساں بہ یمین و یسار

مرکب شہ پیش چو بگذاشت پاے
خلق بہ یکبار در آمد ز جاے

طلعت شہ باز چو پرتو فگند
بانگ دعا گشت ز ہر سو بلند

شور برآمد کہ بود تا جہاں
باد بکام تو زمین و زماں

چرخ بداں مایہ کہ گردندہ است
زندہ بماں کز تو جہاں زندہ است

زیب و طراز ہمہ عالم توئی
سایۂ یزداں بجہاں ہم توئی

جملہ بدانند کہ در غرب و شرق
ہست ترا تاج خلافت بفرق

آں توئی امروز کہ در روزگار
ہست برو دولت و دیں را قرار

تازگی بدر و حنین از تو ہست
زیب و طراز حرمین از تو ہست

جز تو کہ ہست اے شہ انجم سپاہ
آنکہ بود شرعِ نبی را پناہ

فرۂ دینِ نبوی از تو ہست　　　بازوے اسلام قوی از تو ہست
شرع بجاہ تو چو شد ارجمند　　　باد بفرماں تو چرخِ بلند
سکہ اقبال بنامِ تو باد
ہر چہ بگیتی ست بکامِ تو باد[۸۵]

....

[غازی عثمان] پاشاے موصوف مجھ پر نہایت مہربان ہو گئے تھے۔ جب میری روانگی کا زمانہ قریب آیا اور مَیں نے ان سے کہا کہ اَب مَیں یہاں دو چار دِن کا مہمان ہوں تو فرمایا کہ ایک دو دِن جانے سے پہلے مجھ سے مل لینا۔ اسی اثنا میں انھوں نے سلطان سے میرے لیے تمغہ مجیدی عطا ہونے کی درخواست کی اور منظور ہو گئی، لیکن مجھ کو اس کی کچھ اطلاع نہ تھی۔ ایک دِن دوپہر کے وقت مَیں اپنے مکان میں سو رہا تھا کہ میرے ایک دوست دَوڑے ہوئے آئے اور جگا کر کہا، یا شبلی! واللّٰہِ لقد طلع لك النیشان۔ مجھ کو ایک گونہ تعجب ہوا اور مَیں نے کہا کہ یوں ہی کہتے ہو، آخر تم کو معلوم کیونکر ہوا؟ بولے کہ تمام اخبارات میں چھپ گیا ہے۔ مَیں اُسی وقت اُٹھا اور ایک قرأت خانے میں جا کر اخبار دیکھے تو واقعی وہ خبر صحیح تھی۔ اُسی وقت مجھ کو خیال پیدا ہوا کہ مَیں انگریز رعیت ہوں، اس لحاظ سے انگلش سفیر کو اس کی اطلاع دینی ضرور ہے۔ دوسرے دِن مَیں سفیر کے پاس گیا، اتفاق سے وہ مکان پر نہ تھے، مَیں اپنا کارڈ چھوڑ آیا۔ دوسرے دِن تمام احباب مبارک باد کو آئے، مَیں نے ایک مختصر جلسہ دعوت ترتیب دیا۔ دعوت کی صبح کو عثمان پاشا کی وِداعی ملاقات کو گیا۔ پاشاے موصوف نے ملاقات کے ساتھ تمغہ کی مبارک باد دی۔ تمغہ سامنے میز پر رکھا ہوا تھا، بکس سے نکال کر پہلے انھوں نے آنکھوں سے لگایا (سلطان کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی بھی ترک لوگ اس حد تک تعظیم کرتے ہیں)، پھر مجھ کو حوالے کیا۔ مَیں سرو قد کھڑا ہو گیا اور سلطان کو دعا دی۔[۸۶]

۸۵: ایضاً، ۹۹-۱۰۲　　۸۶: ایضاً، ۱۱۵-۱۱۶

[شبلی نعمانی آفندی، جو دارالمعلمین علی گڑھ واقع ہندوستان کا معلمِ اوّل ہے۔
چونکہ شاہانہ تلطفات کا مستحق خیال کیا گیا، اس لیے اس کو تمغۂ مجیدی درجہ چہارم
کے عطا ہونے کے لیے حکمِ والا صادر ہوا اور اس کی سند کے لیے یہ فرمانِ عالی شان
صادر ہوا۔ تحریر ۱۴ ارمحرم الحرام ۱۳۱۰ء][۸۷]

چلتے چلتے کہا کہ ہندوستان پہنچ کر تمام مسلمانوں اور بالخصوص علما اور فضلا کی خدمت میں میرا اسلام پہنچانا اور کہنا کہ عثمان آپ لوگوں سے دلی محبت رکھتا ہے۔[۸۸]

....

قسطنطنیہ میں مَیں پورے تین مہینے مقیم رہا۔ اخیر اخیر طبیعت اچاٹ ہو چلی تھی، یہاں تک کہ مَیں سلطان کے جشن تخت نشینی کا بھی انتظار نہ کر سکا۔ قسطنطنیہ میں ہر سال صفر کی آٹھویں رات، جو سلطان کی تخت نشینی کی رات ہے، بڑی دھوم دھام سے جشن ہوتا ہے، تمام شہر میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ مَیں یہ پُر لطف اور پُر جوش تماشا نہ دیکھ سکا۔ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ ترکی حکومت میں ہر جگہ یہ جشن ہوتا ہے؛ تم جہاں کہیں ہو گے، یہ سیر دیکھ سکو گے۔ مجھ کو بدقسمتی سے اس جشن کی معمولی سیر بھی دیکھنی نصیب نہ ہوئی، کیونکہ اس تاریخ کو مَیں جہاز پر سوار تھا اور آبادی سے دُور آ چکا تھا۔ جب مَیں قسطنطنیہ میں داخل ہوا تھا تو یکہ وتنہا تھا، لیکن واپسی کے وقت [کتنے ہی لوگ] بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوتے ہیں اور دعائیہ الفاظ کے ساتھ خط کتابت اور دوستانہ مراسم کے جاری رکھنے کے وعدے لیتے ہیں۔ جہاز پر پہنچا تو حسین ہندی پہلے سے میرے انتظار میں وہاں موجود تھے۔ ان سے مل کر نہایت خوشی ہوئی۔ دیر تک لطف و محبت کی باتیں رہیں۔ شام کے قریب جہاز نے لنگر اُٹھایا۔[۸۹]

شیخ علی ظبیان، جو اسی جہاز پر اپنے وطن دمشق کو جا رہے تھے، میرے ہم سفر و مونس و غم گسار تھے۔ ایک دِن جہاز پر عجب برہمی اور بے لطفی ہوئی۔ سائپرس میں دو شہر ہیں، لرنکہ اور

۸۷: ایضاً، ۱۱۷
۸۸: ایضاً
۸۹: ایضاً، ۱۱۸، ۱۲۰

لمونہ [لماسول؟Limassol]، دونوں جگہ جہاز لنگر کرتا ہے۔ لرنکہ میں جو لوگ جہاز پر سوار ہوئے، ان میں سائپرس کا ایک رئیس تھا اور چونکہ اس کو صرف لمونہ تک جانا تھا، تیسرے درجے کی چھت پر ہمارے دوست شیخ علی ظبیان کے بستر کے قریب آ بیٹھا۔ شیخِ موصوف باوجود فضل وکمال کے، تنک مزاج آدمی ہیں۔ رئیس مذکورہ نے ان کے بستر پر کوئی چیز رکھ دی۔ اتنی بات پر یہ برہم ہو گئے۔ وہ غریب تو چپ رہا، لیکن اس کا نوکر، جو صورت سے قوی اور تنومند معلوم ہوتا تھا، ضبط نہ کر سکا۔ بات زیادہ بڑھی، یہاں تک کہ جہاز کے اَور مسافر، جو اکثر شامی عرب تھے، اِدھر اُدھر سے آ کر جمع ہو گئے۔ عربوں کا سہارا پا کر ہمارے دوست زیادہ تیز ہوئے۔ نوکر نے کہا، 'آپ غصہ کیوں کرتے ہیں؟ ہم آپ کی کچھ رعایا نہیں، ہمارا شہر انگریزی حکومت سے تعلق رکھتا ہے'۔ ان الفاظ کا اس کے منہ سے نکلنا تھا کہ تمام عرب برہم ہو گئے، یہاں تک کہ ایک عرب نے کمر سے پکڑ کر اُس کو اُٹھا لیا اور کہا کہ 'مردُود! تجھ کو دریا میں پھینک دیتا ہوں'۔ اگرچہ ہجوم کی وجہ سے نہایت کشمکش تھی اور بعض آدمی اُس کو روکتے بھی رہے، تاہم وہ لوگوں کو ہٹاتا ہوا جہاز کے کنارے تک پہنچ گیا اور اس زور سے دو تین جھٹکے دیے کہ قریب تھا کہ وہ غریب سمندر میں جا پڑے۔ اُس وقت چند آدمیوں نے نوکر کو بزور اُس کے قبضے سے چھڑا کر اشارہ کیا کہ 'کمبخت! جہاز کے کسی گوشے میں چھپ جا'۔ پھر بھی تمام عرب دیر تک غل کرتے اور انگریزی حکومت کی شان میں نامناسب الفاظ کہتے رہے۔ مجھ کو تعجب ہوتا ہے کہ جہاز کے افسر یہ ہنگامہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور مطلق دخل نہیں دیتے تھے۔[۹۰]

....

[جہاز نے لماسون میں لنگر کیا، مَیں اُسی مدرسے میں گیا۔] صبح کا وقت تھا اور مدرّس صاحب اُس وقت تک تشریف نہیں لا چکے تھے۔ دو تین لڑکے موجود تھے، وہ نہایت ادب اور خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ ایک نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا وطن کہاں ہے؟ مَیں نے کہا، 'ہندوستان'۔ بولا، 'ہندوستان ایک وسیع ملک ہے، خاص شہر کا نام بتائیے'۔ مَیں نے علی گڑھ

۹۰: ایضاً، ۱۲۰-۱۲۱

کا نام لیا۔ کہنے لگا، 'مَیں نقشہ میں دیکھتا ہوں، کہاں واقع ہے؟' ہندوستان کا نقشہ سامنے آویزاں تھا، اُس نے ایک سرسری نگاہ دَوڑائی اور فوراً علی گڑھ پر انگلی رکھ کر کہا، 'ہاں، یہ ہے'۔ اس کی عمر نو دس برس سے زیادہ نہ تھی، اس لیے مجھ کو اس کی اس تیزی اور یادداشت پر تعجب ہوا۔[91] مجھ کو اس قدر قلیل زمانے میں یہاں کے مسلمانوں کی حالت کا صحیح اندازہ تو کیا ہو سکتا تھا، لیکن ظاہر طور سے قیاس ہوتا تھا کہ اچھی نہیں۔ جس قدر بلند مکانات یا عمدہ دُکانیں نظر آئیں، دریافت سے معلوم ہوا کہ کُل عیسائیوں کی ہیں۔[92]

....

ساتویں دِن ہمارا جہاز بیروت پہنچا۔ شیخ علی ظبیان جہاز سے اُترے، مَیں بھی ان کے ساتھ اس ارادے سے اُترا کہ جہاز کے روانہ ہونے تک واپس آ جاؤں گا۔ شہر میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شیخ طاہر مغربی، اتفاقات سے آج کل یہیں ہیں۔ شیخ موصوف دمشق میں مدرّس ہیں اور اُن کے فضل و کمال کی ان اطراف میں بڑی شہرت ہے۔ مَیں نے قسطنطنیہ میں ان کے اوصاف سنے تھے۔ شیخ علی ظبیان نے کہا، 'تم کو ان ممالک میں دوبارہ آنا نہیں ہے، اس لیے شیخ طاہر کی ملاقات کا موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے'۔ غرض، ان کی صلاح سے مَیں جہاز سے اپنا اسباب اُتروالایا اور ایک ہفتے تک بیروت میں مقیم رہا۔[93]

مشہور ہے کہ تندرستی کے لیے [یہ شہر] بہت مفید ہے۔ شاید ایسا ہی ہو، لیکن میرا تجربہ اس کے خلاف ہے۔ مَیں جب تک وہاں رہا، طبیعت بدمزہ رہی۔ دو تین دِن بخار بھی آیا اور علاج کی ضرورت پڑی۔[94]

بیروت میں اگرچہ بہت سے اسکول و کالج ہیں، لیکن یہ کالج [الکلیۃ السوریۃ العلمیۃ] یونیورسٹی ہے۔[95] یہ کالج ۱۸۷۵ء میں رومن کیتھولک پادریوں نے قائم کیا۔ جب مَیں اس کالج میں گیا تو شیخ علی ظبیان اور عبدالباسط آفندی ساتھ تھے۔ کالج کی عمارت دومنزلہ ہے۔

۹۱: ایضاً، ۲۶
۹۲: ایضاً، ۲۷
۹۳: ایضاً، ۱۲۱
۹۴: ایضاً، ۱۲۲
۹۵: ایضاً، ۱۲۶

نیچے کے درجے میں چھاپہ خانہ ہے اور یہ وہی چھاپہ خانہ ہے، جس نے عمدگیِ طبع کی وجہ سے بیروت کو تمام دنیا میں رُوشناس کر دیا ہے۔ جس شخص نے ہمارا استقبال کیا، اس کا نام الیاس ہے اور چھاپہ خانے کا تمام اہتمام اسی سے متعلق ہے۔ الیاس نے پہلے ہم کو مطبع کی سیر کرائی۔[۹۶] چھاپہ خانے سے فارغ ہو کر ہم نے کالج کو دیکھنا چاہا۔ چونکہ اس کام کے لیے کالج کے کسی پروفیسر کا رہنما ہونا ضرور تھا۔ الیاس نے پہلے پروفیسر انطون سے ہماری ملاقات کرائی۔[۹۷] ہم نے اس کی وجہ سے کالج کی ایک ایک عمارت اور آلات کی سیر کی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کالج یہاں کے عیسائیوں کے لیے باعثِ فخر اور تمام مسلمانوں کے لیے موجبِ رشک ہے۔ مصر و شام کا تو کیا ذکر ہے، قسطنطنیہ کا بھی کوئی کالج اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ عمارت اس قدر شاندار، موزوں اور خوب صورت ہے کہ بیاں نہیں ہو سکتا۔ اوپر کی منزل کا فرش بالکل سنگِ مرمر کا ہے اور سنگِ سیاہ کی پچی کاری ہے۔ کمرے نہایت کثرت سے ہیں۔ پروفیسر اور ٹیچر، جو ساٹھ سے زیادہ ہیں اور شب و روز کالج ہی میں رہتے ہیں، سب کے لیے الگ الگ کمرے ہیں۔ ایک عالی شان کمرہ، جو نہایت عمدہ فرنیچر اور ساز و سامان سے آراستہ ہے اور جس کے بیچ میں مستطیل میز اور گرد بہت سی خوب صورت کرسیاں بچھی ہیں، پروفیسروں اور استادوں کے لیے مخصوص ہے۔ فرصت کے اوقات میں وہ لوگ یہاں آ بیٹھتے ہیں اور دوستانہ صحبت رہتی ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی ہے، جس کا جی چاہتا ہے، کوئی کتاب اُٹھا لیتا ہے اور اس سے دل بہلاتا ہے۔ مجھ کو اُس وقت خیال آیا کہ ہمارے [علی گڑھ] کالج میں یہ بڑی کمی ہے کہ اس قسم کی کوئی عمارت نہیں، جہاں تمام اساتذہ گھڑی دو گھڑی مل بیٹھا کریں، حالانکہ اس قسم کی صحبت دل بہلانے کے سوا قومی مذاق کے لیے نہایت مفید ہے۔ کالج میں سائنس اور علومِ جدیدہ کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجے پر ہوتی ہے اور اس غرض سے نہایت بیش قیمت آلات اور نایاب چیزیں مہیا کی گئی ہیں۔[۹۸]

۹۶: ایضاً، ۱۲۷

۹۷: ایضاً، ۱۲۸

۹۸: ایضاً، ۱۲۹

کالج کے ساتھ بورڈنگ بھی ہے۔ کالج کی لائبریری اگرچہ بہت بڑی نہیں ہے، لیکن نادر اور کمیاب کتب جمع کی گئی ہیں۔ جو کتابیں چھپی نہیں اور ان کے قدیم نسخے نہیں مل سکے، یورپ اور ایشیا کے مشہور کتب خانوں سے اُن کی نقل واستنساخ کا انتظام کیا ہے۔ طلبہ کی تعداد پانچ اور چھ سو کے بیچ میں ہے، جن میں مسلمان صرف آٹھ یا دس ہیں۔ کالج کی عمارت، باوجود اس کے کہ بیروت میں تمام چیزیں نہایت ارزاں ہیں، دس لاکھ فرانک میں تیار ہوئی ہے اور یہ کُل رقم پادریوں کی ایک جماعت نے ادا اور مہیا کی ہے۔ اس کالج کے ساتھ میڈیکل کالج بھی ہے، لیکن اس کی عمارت کسی قدر فاصلے پر ہے۔ پروفیسر انطون نے ہم کو اس کی بھی سیر کرائی۔ عمارت نہایت وسیع اور بلند اور آلات نہایت بیش قیمت اور کثرت سے ہیں[۹۹]۔

معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر مذکور مجھ سے مل کر خوش ہوا، چنانچہ اس ہفتے میں [اس کی زیرِ ادارت] البشیر کا جو پرچہ نکلا، اس میں ایک اڈیٹوریل نوٹ میرے متعلق تھا[۱۰۰]۔

بیروت میں قیام کرنے کا اصلی سبب شیخ طاہر مغربی سے ملنا تھا، چنانچہ عبدالباسط الانسی کے ذریعے سے ان سے ملاقات ہوئی اور دیر تک علمی صحبت رہی۔ دو تین دفعہ اَور ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک بار فرودگاہ پر بھی تشریف لائے۔ شیخ موصوف ابھی جوان ہیں، لیکن علم وفضل کی وجہ سے لوگ اُن کی بہت عزت کرتے ہیں۔ مَیں نے اُن کے کمال کا جس چیز کو جوہر سمجھا اور جس کا مجھ کو خود تجربہ ہوا، وہ یہ تھا کہ شیخ موصوف اَور علما کی طرح محدود خیال کے آدمی نہیں ہیں۔ نئے خیالات سے آشنا ہیں، کسی قدر فرنچ بھی جانتے ہیں، فرانس کی سیر کی ہے، قومی ہمدردی کا مادہ ہے اور مسلمانوں کے تنزل سے بےخبر نہیں ہیں۔ اگر یہ مذاق ان ممالک کے عام علما میں پیدا ہو جائے تو ترقی کی واقعی امید ہو سکتی ہے۔ شیخ موصوف دمشق کے مدرسے میں مدرّس ہیں، وہ صاحبِ تصانیف بھی ہیں اور ریاضی کے فن میں ان کی بعض تصنیفات چھپ کر شائع بھی ہو چکی ہیں[۱۰۱]۔

۹۹: ایضاً، ۱۳۰ ۱۰۰: ایضاً، ۱۳۱

۱۰۱: ایضاً، ۱۳۲-۱۳۴

بیروت کے اَور علما اور اہلِ کمال سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ مَیں معمولاً عبدالباسط الانسی کی دُکان پر بیٹھا کرتا تھا، وہاں اکثر اہلِ علم اور اربابِ مناصب آ نکلتے تھے اور ان سے ملاقات وتعارف ہو جاتا تھا؛ یہاں تک کہ شہر میں زیادہ چرچا ہوا تو بعض بعض حضرات میری قیام گاہ پر بھی تشریف لائے۔ ان میں شیخ عمر جیلی اور ایک اَور صاحب، جن کا نام اب یاد نہیں رہا، میرے حال پر نہایت عنایت فرماتے تھے۔ شیخ عمر جیلی مشہور رسالے الصفا کے مالک اور مہتمم ہیں اور نہایت فیاض اور خوش اخلاق ہیں؛ دوسرے صاحب، جو طالب علم ہیں، منطق کی تحصیل کی غرض سے تشریف لائے۔ مَیں نے تنگیِ وقت کا عذر کیا، تاہم وہ اکثر تشریف لاتے تھے اور فن وادب کے مذاکرے رہتے تھے۔[۱۰۲]

ایک دِن عبدالباسط الانسی نے میری دعوت کی اور بیروت کے اکثر مشہور علما کو مدعو کیا، [الجزائر کے بادشاہ] شیخ عبدالقادر جزائری کے بھتیجے شیخ عبدالرحمٰن الجزائری بھی تشریف رکھتے تھے، نہایت معمر اور صاحبِ علم ہیں۔ عبدالباسط الانسی کے مکان میں چھوٹا سا خوب صورت پائیں باغ ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد سب لوگ کھانے کے کمرے میں گئے۔ کھانا انگریزی طریقے پر تھا، یعنی میز اور کرسیاں تھیں اور ایک کھانا ہو چکتا تھا تو دوسرا لایا جاتا تھا۔ ایک ڈش کے بعد دوسری ڈش آتی تھی۔ مَیں نے شیخ طاہر مغربی سے کہا کہ 'ہندوستان میں ایسا اتفاق ہوا تو من تشبّہ بقومٍ کا فتویٰ لگایا جاتا۔ بولے کہ 'اُن ممالک میں یہی مناسب ہے، کیونکہ وہاں اسلامی حکومت نہیں رہی، اس لیے رسم و رواج اور مذہبی تعصبات کا (گو وہ صحیح نہ ہوں) قائم رکھنا ضروری ہے، تاکہ مذہب کا عام اثر کم نہ ہونے پائے، لیکن اسلامی ممالک میں ان فضول باتوں کی کچھ ضرورت نہیں'۔ یہ صحبت دیر تک رہی اور بڑے لطف سے گزری۔ کھانے بھی نہایت لذیذ اور خوش گوار تھے۔[۱۰۳]

چونکہ یہاں [بیروت] کی آب وہَوا مرطوب ہے، میری طبیعت برابر بدمزہ رہی۔ ایک دِن بخار بھی آ گیا۔ اس بخار نے بڑا حرج یہ کیا کہ طرابلس کی سیر مفت میں جاتی رہی۔

۱۰۲: ایضاً، ۱۳۴

۱۰۳: ایضاً، ۱۳۴-۱۳۵

اُن دِنوں طرابلس کے بعض علما اتفاق سے وہاں آ گئے تھے، ایک صحبت میں اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان لوگوں نے نہایت اصرار کیا کہ ہمارے ساتھ طرابلس چلو۔ بعض اسلامی خصوصیتوں کے لحاظ سے بڑا یادگار مقام خیال کیا جاتا ہے۔ بیروت سے صرف دو دن کی راہ ہے۔ کافی وقت تھا کہ مَیں وہاں جا کر جہاز کی روانگی تک واپس آ جاتا۔ مَیں نے ہر طرح تیاری بھی کر لی تھی، لیکن عین وقت پر بخار آ گیا اور یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔[۱۰۴]

عبدالباسط آفندی کے بڑے بھائی عبدالرحمٰن الانسی یہاں کے مشہور ڈاکٹروں میں ہیں، علاج کی غرض سے مَیں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے نہایت مہربانی کی اور کہا کہ 'آپ اپنی قیام گاہ پر تشریف لے جائیں گے تو دوا وہیں پہنچ جائے گی'، چنانچہ دو گھنٹے کے بعد ایک آدمی دوا کی شیشی لے کر آیا۔ دوا سریع الاثر ہونے کے ساتھ خوش مزہ بھی تھی، بخار اُسی دِن جاتا رہا۔[۱۰۵]

شیخ علی ظبیان، جو کئی مہینے تک انیس و ہمدم رہے تھے، صرف میری وجہ سے بیروت میں مقیم تھے۔ دمشق سے ان کے والد ماجد کا خط آیا اور ان کو مجبوراً جانا پڑا۔ رات کے آٹھ بجے روانگی کا وقت تھا۔ رخصت کے وقت گلے مل کر میرے شانوں کو بوسہ دیتے تھے (جو یہاں کا عام دستور ہے) اور یہ شعر پڑھتے تھے:

تمتع من شمیم عرارِ نجد

فما بعد العشية من عرار

[ترجمہ] اب نجد کے عرار [نامی پھول] کی خوشبو سے لطف اُٹھانا ہو تو اُٹھا لو، ورنہ آج کی رات کے بعد پھر عرار نصیب نہیں ہونے کا۔[۱۰۶]

بیروت میں میری طبیعت یوں ہی بدمزہ تھی، شیخ علی ظبیان اور شیخ طاہر مغربی کے چلے جانے کے بعد اَور بھی وحشت ہوئی، لیکن جہاز کے انتظار میں چار و ناچار دو تین روز اَور ٹھہرنا

۱۰۴: ایضاً، ۱۳۵-۱۳۶ ۱۰۵: ایضاً، ۱۳۵

۱۰۶: ایضاً، ۱۳۶

پڑا۔ ۸ صفر ۱۳۱۰ھ شام کے وقت بیروت سے روانہ ہوا۔ شیخ عبدالباسط اور شیخ عمر جیلی بندرگاہ تک ساتھ آئے اور انھی کے ذریعے سے اسباب وغیرہ کے انتظام میں نہایت آسانی ہوئی۔[۱۰۷]

....

دوسرے دن جہاز یافہ پہنچا۔[۱۰۸] بیت المقدس یہاں سے چالیس میل ہے۔ مَیں مغرب کے قریب سوار ہوا۔ راہ میں بعض مشہور مقامات (رملہ وغیرہ) آئے، لیکن رات کی وجہ سے مَیں کچھ دیکھ نہ سکا۔ صبح ہوتے ہوتے پہاڑوں کا سلسلہ نظر آیا، جو برابر بلند ہوتا چلا گیا ہے۔ سڑک اگرچہ بڑے کج و پیچ سے چکر کھاتی ہوئی گئی ہے، لیکن نہایت صاف اور ہموار ہے۔ پہاڑ کا دامن بالکل سرسبز اور شاداب ہے اور عجیب لطف و فضا کا مقام ہے۔ جا بجا عرب بدوؤں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں۔ مکانات اگرچہ تنگ و مختصر ہیں، لیکن بالکل سفید پتھر کے ہیں۔ سبزہ زار میں یہ سپیدی نہایت خوش نما معلوم ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ دس بارہ میل چل کر ختم ہوا اور بیت المقدس کی آبادی نظر پڑی۔[۱۰۹]

بیت المقدس کے مشہور اور نامور عالم سید طاہر ہیں، جو مفتی شہر ہیں اور مفتی ہی کے نام سے مشہور ہیں۔ چونکہ قسطنطنیہ میں مَیں نے ان کی تعریف سنی تھی، اس لیے بیت المقدس پہنچ کر سب سے پہلے انھی کی ملاقات کا قصد کیا۔ جونہی مَیں کمرے میں داخل ہوا، مفتی صاحب اور تمام حاضرین تعظیم کو اُٹھے (یہ طریقہ یہاں عام ہے اور ہر شخص کے لیے برتا جاتا ہے)۔ مزاج پُرسی اور مختصر حالات پوچھنے کے بعد ایک صاحب نے فرمایا کہ 'غالباً آپ علما میں سے ہیں'۔ مَیں نے کہا کہ 'عالم تو نہیں، البتہ طالب علم ہوں'۔ وہ پہلے سے ایک علمی مسئلے کے متعلق گفتگو کر رہے تھے اور میرے پہنچنے کی وجہ سے ان کی صحبت برہم ہوگئی تھی۔ جب ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ مَیں بھی کچھ پڑھا لکھا ہوں تو ایک صاحب نے نہایت تہذیب اور معقولیت سے کہا کہ 'ہم لوگ ابھی ایک مسئلے کے متعلق گفتگو کر رہے تھے، اگر آپ پسند فرمائیں تو وہ

۱۰۷: ایضاً، ۱۳۷
۱۰۸: ایضاً، ۱۳۷
۱۰۹: ایضاً، ۱۳۸

مسئلہ آپ کے سامنے بھی پیش کیا جائے۔' غرض انھوں نے وہ مسئلہ بیان کیا اور وہ یہ تھا کہ 'قرآنِ مجید کی اس آیت میں کہ اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ، اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ [۸۹:۶-۷]۔ خدا نے آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے کہا کہ تُو نے یہ واقعہ نہیں دیکھا، حالانکہ یہ واقعہ آنحضرتؐ کی ولادت سے سیکڑوں برس پہلے واقع ہوا تھا'۔ مَیں نے کہا کہ 'رویت کا اطلاق علمِ یقینی پر بھی ہوتا ہے۔ خود قرآنِ مجید میں ہے، اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحَابِ الْفِیْلِ [۱۰۵:۱]۔ عرب جاہلیہ کے اشعار میں بھی یہ اطلاق جابجا موجود ہے'۔ ایک صاحب نے میری تقریر پر اعتراض کرنا چاہا، لیکن مفتی صاحب نے کہا، 'یہ جواب بالکل صحیح ہے اور اس میں جائے گفتگو نہیں'۔ مَیں جب تک بیت المقدس رہا، قریباً ہر روز اس پُرلطف صحبت میں شریک ہوتا رہا۔[۱۱]

جس زمانے میں قسطنطنیہ میں مقیم تھا، عبدالسلام آفندی کے برادرِ عم زاد شاکر آفندی مقدمہ کی ضرورت سے قسطنطنیہ میں آئے۔ عبدالسلام آفندی نے ان کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا، لیکن ان کے کمرے میں جگہ نہ تھی، مجھ سے کہا کہ تم اپنے ساتھ ٹھہرالو، مَیں نے ان کی خاطر سے گوارا کیا۔ میری روانگی کا زمانہ قریب آیا تو انھوں [شاکر آفندی] نے کہا کہ مَیں بھی آمادۂ سفر ہوں، ساتھ ہوتا تو خوب تھا، لیکن اس وقت میرے پاس روپے نہیں۔ گھر سے کچھ روپے منگوائے ہیں، ان کے آنے کا انتظار ہے۔ چونکہ وہ خاص بیت المقدس کے رہنے والے تھے، مجھ کو خیال ہوا کہ ان کی وجہ سے آسائش و آرام کے علاوہ بیت المقدس میں مجھ کو ہر ایک چیز کی تحقیق و اطلاع میں بہت مدد ملے گی۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ روپے مجھ سے لے لیجیے، وہاں چل کر ادا کر دیجیے گا۔ انھوں نے انکار کیا اور باوجود اصرار کے کسی طرح رضامند نہ ہوتے تھے، لیکن مَیں نے اس قدر مجبور کیا کہ وہ انکار نہ کر سکے اور مَیں نے اُسی وقت دوسو روپے ان کو حوالے کیے۔ عبدالسلام آفندی اُس وقت مکان پر نہ تھے، شام کو باہر سے آئے تو بات بات میں یہ تذکرہ آیا۔ انھوں نے یہ واقعہ سن کر سر پیٹ لیا اور نہایت پریشان ہوئے اور بار بار کہتے تھے کہ شو فعلت، شو فعلت، یعنی تم نے یہ کیا غضب کیا؟

۱۱۔ [illegible]، ۱۳۲-۱۳۳

شاکر گو میرا بھائی ہے، لیکن نہایت آوارہ ہے اور اسی نے تم سے فریب دے کر روپے لیے۔ لطف یہ کہ روپے تو میرے معرضِ خطر میں تھے، لیکن عبدالسلام آفندی کو مجھ سے بڑھ کر اضطراب تھا۔ شاکر آفندی گھر میں آئے تو عبدالسلام آفندی نے ان کو سخت ملامت کی اور ان سے دستاویز لکھوا کر اس پر اپنی اور ایک اَور شخص کی گواہی لکھی۔ مجھ کو الگ لے جا کر کہا کہ قومی بدنامی کا معاملہ ہے، اس لیے مجھ کو اپنے بھائی کی پردہ دری کرنی پڑتی ہے۔ یہ لڑکا (شاکر) آوارہ مزاج اور بدمعاملہ ہے، اس کی کوئی ذاتی جائداد بھی نہیں۔ اس کا چچا عبدالرزاق اس کا کفیل ہے۔ یہ دستاویز انھی کے حوالے کرنا، وہ تم کو روپے دے دیں گے۔ غرض دوسرے دِن شاکر اور مَیں ساتھ جہاز پر سوار ہوئے۔ سمرنا میں پہنچے تو شاکر کے نام ان کے وکیل کا تار آیا کہ فوراً واپس آؤ۔ شاکر نے مجھ سے کہا کہ مَیں تم کو چھوڑ کر کیونکر جا سکتا ہوں۔ مَیں نے اُن کا روکنا مناسب نہ سمجھا اور بخوشی، بلکہ بہ اصرار اُن کو واپس بھیجا۔ بیت المقدس پہنچ کر سیدھا عبدالرزاق کے پاس گیا اور مجھ کو اس موقع پر مجبوری اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے میرے ساتھ سخت بداخلاقی کی۔ اس کی شکایت نہیں کہ روپے نہیں دیے، تعجب یہ ہے کہ کج اخلاقی سے پیش آئے۔ دوسرے دِن مَیں نے مفتی صاحب کے پاس جا کر اُن سے سارا قصہ کہا اور دستاویز دِکھلائی۔ مفتی [سید طاہر] صاحب نے عبدالرزاق کے پاس آدمی بھیجا۔ انھوں نے کہلا بھیجا کہ 'اِس وقت میرے پاس روپیہ نہیں، دو چار دِن کے بعد البتہ ادا کر سکتا ہوں'۔ مفتی صاحب کو چونکہ اطمینان تھا، وہ یہ کہہ کر چپ ہو رہے کہ ضرور مل جائیں گے، لیکن اَور لوگ، جو وہاں موجود تھے اور عبدالرزاق کے خاندان کے ممبر تھے، سخت برہم ہوئے تھے اور غصے میں آ کر کہتے تھے، وہ اپنی داڑھی بیچے اور روپے ادا کرے۔ دوسرے دِن مَیں مفتی صاحب کے پاس گیا تو انھوں نے پوری رقم، یعنی دو سو روپے اپنے پاس سے دیے۔ مَیں نے کہا، آپ اپنی جیب سے دیتے ہیں تو مَیں لینا نہیں چاہتا۔ فرمایا کہ 'نہیں، عبدالرزاق نے مجھ پر حوالہ کر دیا ہے، لیکن اگر وہ نہ بھی دیتے اور

میرے پاس روپے نہ بھی ہوتے تو مَیں اپنا جبہ بیچ کر دیتا'۔ باوجود اس کے مفتی صاحب اور دیگر حاضرین کو سخت ندامت تھی، وہ لوگ مجھ سے نہایت اِلحاح سے معذرت کرتے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ 'ہماری آنکھ تم سے برابر نہیں ہوتی'۔ مَیں جب رخصت ہوکر چلا تو مفتی صاحب نے کچھ دُور تک مشایعت کی اور کہا کہ مجھ کو امید ہے کہ آپ ہمارے عیب پر پردہ ڈالیں گے، کیونکہ شرفا کا کام پردہ پوشی ہے'۔ مفتی صاحب اور ان کے ہم نشینوں کو عبدالرزاق کے برتاؤ پر جو ندامت تھی اور جس طرح وہ بار بار مجھ سے معافی چاہتے تھے، اُس کا اثر اب تک مَیں اپنے دل میں پاتا ہوں[۱۱۱]۔

[غرض عبدالرزاق کی بے اعتنائی کے بعد] ہوٹل میں جانے کا قصد کیا۔ راہ میں ہندیوں کا زاویہ تھا۔ مَیں نے خیال کیا کہ یہاں کے لوگوں سے ملنا مفید ہوگا، چنانچہ زاویہ میں داخل ہوا تو پہلے شیخ زاویہ کا سامنا ہوا۔ یہ شیخ رامپور کے رہنے والے ہیں اور ایک مدت سے یہاں رہتے ہیں۔ بے چارے کچھ پڑھے لکھے نہیں، نہایت معقول اور منتظم آدمی ہیں۔ زاویے کو نہایت خوش سلیقگی سے درست کیا ہے۔ ایک کمرہ، جو ملاقاتیوں کے لیے مخصوص ہے، معقول طور پر آراستہ ہے۔ سلام علیک اور مزاج پُرسی کے بعد باتوں باتوں میں جب ان کو معلوم ہوا کہ مَیں ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتا ہوں تو انھوں نے کہا کہ تم کو یہاں مفتی صاحب اور دیگر اہلِ علم سے ملنا ہے، وہ ہوٹل میں ٹھہرنا معیوب خیال کرتے ہیں، چنانچہ مَیں زاویے ہی میں ٹھہرا؛ لیکن زاویے کا کھانا اس خیال سے نہیں کھاتا تھا کہ وہ فقرا اور محتاجوں کے لیے مخصوص ہے[۱۱۲]۔

مَیں اگست کے آغاز میں [بیت المقدس] پہنچا تھا، تاہم دِن کو گلابی جاڑا ہوتا تھا اور رات کو اچھی خاصی سردی پڑتی تھی۔ میوے کثرت سے اور نہایت شیریں و لذیذ ہوتے ہیں۔ اُس وقت انگور کا آغاز تھا، میرا تمام دِن یہ مشغلہ رہتا تھا کہ انگور کے دانے ٹونگا کرتا تھا[۱۱۳]۔ بیت المقدس اور اس کے قرب و جوار میں بہت سی زیارت گاہیں ہیں، ایک افسوس ہے

۱۱۱: ایضاً، ۱۹۰-۱۹۲ ۱۱۲: ایضاً، ۱۳۸-۱۳۹

۱۱۳: ایضاً، ۱۳۹-۱۴۰

کہ بعض اتفاقات کی وجہ سے مَیں ان مقامات کی زیارت سے مشرف نہ ہوسکا۔ مقامِ خلیل کے لیے، جو بیت المقدس سے پندرہ بیس میل ہے، مَیں نے دو تین روز برابر کوشش کی، لیکن ان دنوں یہودیوں کا کوئی تیوہار تھا، اس لیے سواریاں بالکل ناپید تھیں اور ملتی بھی تھیں تو چوگنے کرایے پر ملتی تھیں[۱۱۴]۔

قمامہ وہی قیامت زا مقام ہے، جس کے لیے ایک زمانے میں تمام یورپ اُمنڈ آیا تھا اور مدتوں تک یہ طوفان برپا رہا تھا۔ یہ ایک نہایت وسیع گرجا ہے اور عیسائیوں کے موافق حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی مقام میں مصلوب و مدفون ہوئے اور یہیں سے، آسمان پر گئے۔ اس مکان کا اہتمام و انتظام اگرچہ عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے، لیکن چونکہ ترکی حکومت میں واقع ہے اور چھ لاکھ اہلِ یورپ کے مقابلے میں صلاح الدین کی معرکہ آرائیوں کی یادگار ہے، اس لیے اس کا جواب، یعنی کلید بردار مسلمان ہے، چنانچہ جب مَیں اس گرجے میں گیا تو اُسی کی رہبری سے تمام مقامات کی سیر کی[۱۱۵]۔

ان ممالک میں علما کو عمامہ یا ٹوپی پر ایک سفید دھجی، جس کو لفہ کہتے ہیں، لپیٹنا ضروری امر ہے۔ مَیں جس دِن قمامہ کی سیر کو گیا، میرے سر پر صرف ٹوپی تھی، عمامہ نہ تھا۔ راہ میں جا رہا تھا کہ ایک صاحب نے، جو رُوشناس ہو گئے تھے، دیکھ لیا اور مفتی صاحب کے جلسے میں اس کا تذکرہ کیا۔ چونکہ وہاں کی رسم کے موافق یہ بالکل نئی بات تھی، لوگوں میں اس کے چرچے ہوئے، یہاں تک کہ دوسرے دِن، جب مَیں مفتی صاحب کے دربار میں گیا تو ایک صاحب نے بڑے تعجب اور حیرت سے پوچھا کہ 'ہم نے سنا کہ جنابِ والا عمامہ ولفہ کے بغیر بازار میں نکلے'۔ مَیں کہا، 'ہاں، مَیں عیسائیوں کے گرجے میں گیا تھا اور ایسے مقامات کے لیے عالمانہ لباس موزوں نہیں ہے'۔ سب بول اُٹھے کہ 'آپ نے بالکل بجا کیا'[۱۱۶]۔

ایک دِن مَیں بخارا والوں کے زاویے میں گیا۔ اتفاق یہ کہ اُسی دِن بخارا کے چند

۱۱۴: ایضاً، ۱۴۲

۱۱۵: ایضاً، ۱۴۲

۱۱۶: ایضاً، ۱۴۴-۱۴۵

رئیس اور معزز لوگ حج سے پھر کر بیت المقدس کی زیارت کو آئے تھے۔ شیخ زاویہ نے مجھ کو ان لوگوں سے ملایا۔ صورت اور وضع سے دولت مند اور محترم و موقر معلوم ہوتے تھے۔ بعض صاحبِ علم اور فقیہ تھے۔[۱۱۷]

....

بیت المقدس سے روانہ ہو کر مَیں یافہ میں آیا اور وہاں سے جہاز میں سوار ہو کر تیسرے دِن اسکندریہ پہنچا۔[۱۱۸] مجھ کو قاہرہ جانے کی جلدی تھی، اس لیے مَیں نے اُسی وقت گاڑی کرایہ کی اور اسٹیشن پہنچا۔ دس بجے ٹرین روانہ ہوئی۔[۱۱۹] ریل شام کے قریب قاہرہ پہنچی اور مَیں نے جامعہ ازہر کے قریب ایک لوکانده (ہوٹل) میں قیام کیا۔ بیروت میں عبدالباسط آفندی نے مجھ کو ایک خط دیا تھا کہ قاہرہ پہنچ کر شیخ عبدالحلیم کے پاس بھجوا دینا۔ شیخ عبدالحلیم عبدالباسط آفندی کے چچیرے بھائی ہیں اور جامعہ ازہر میں پڑھتے ہیں۔ مَیں نے وہ خط اُن کے پاس بھجوا دیا، وہ دوسرے دِن ہوٹل میں تشریف لائے اور کہا کہ 'اگر آپ کو یہاں کے علمی حالات دریافت کرنے ہیں اور علما اور شیوخ سے ملنا ہے تو ہوٹل میں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ یہاں علما اس کو بہت معیوب سمجھتے ہیں'، چنانچہ ان کی بات کے موافق مَیں جامعہ ازہر میں گیا اور انھوں نے رواق الشائین میں ایک پُر فضا حجرہ میرے لیے خالی کرا دیا۔ ایک مہینے سے زیادہ مَیں مقیم رہا۔ شیخ عبدالحلیم قریباً ہر وقت پاس رہتے تھے اور میری تمام ضرورتوں کو انجام دیتے تھے۔ وہ میرے رہنما، انیس معرف اور اگر گستاخی نہ ہو تو نوکر اور خادم بھی تھے اور نوکر بھی بے تنخواہ، بے غرض۔[۱۲۰]

مجھ کو اپنے تمام سفروں میں جس قدر جامعہ ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا، کسی چیز سے نہیں ہوا۔ ایک ایسا دار العلوم، جس میں دنیا کے ہر حصے کے مسلمان جمع ہوں، جس کا سالانہ خرچ دو تین لاکھ سے کم نہ ہو، جس کے طالب علموں کی تعداد بارہ ہزار

۱۱۷: ایضاً، ۱۴۵
۱۱۸: ایضاً
۱۱۹: ایضاً، ۱۴۶
۱۲۰: ایضاً، ۱۴۷

سے متجاوز ہو؛ اس کی تعلیم و تربیت سے کیا کچھ امید نہیں ہو سکتی؛ لیکن افسوس ہے کہ وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے لاکھوں مسلمان برباد کر چکا ہے اور کرتا جاتا ہے۔ تربیت و معاشرت کا جو طریقہ ہے، اُس سے حوصلہ مندی، بلند نظر، جوش، ہمت، غرض تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے۔ مَیں نے یہاں ایسے طلبہ دیکھے ہیں، جن کے عزیز اور نہایت قریبی عزیز (چچا، ماموں وغیرہ) خود اسی شہر میں بڑے بڑے معزز عہدوں پر ہیں اور ان کی تمام ضروریات کے متکفل بھی ہیں، تاہم چونکہ یہ طلبہ از ہر میں رہتے ہیں، اس لیے ان کو عام بازار میں ہاتھ پھیلا کر روٹیاں لینے میں ذرا شرم نہیں آتی۔ طالب علموں کی دَنایَت اور پست حوصلگی کا یہ حال ہے کہ بازار میں پیسے کی ترکاری خریدتے ہیں تو کنجڑے کو قسم دلاتے ہیں کہ 'تجھ کو امام حسینؓ کے سر کی قسم! واجبی قیمت بتانا'۔ کیا اس قسم کے تربیت یافتہ لوگوں سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کی عظمت و شان بڑھائیں گے؟ ہمارے ملک میں اس قسم کے جو مدرسے ہیں، از ہر اُن سے بھی گیا گزرا ہے۔[۱۲۱] زیادہ افسوس یہ ہے کہ تعلیم کسی اصول پر نہیں، نہ صف بندی ہے، نہ کوئی نصاب ہے، نہ امتحان ہوتا ہے، نہ ترقی پانے کے لیے کوئی قاعدہ مقرر ہے۔ افسوس پر افسوس یہ ہے کہ ان اَبتریوں کی اصلاح کی کوئی تدبیر نہیں۔ علی پاشا مبارک نے، جو ایک زمانے میں سررشتہ تعلیم کا افسر تھا، کچھ اصلاح کرنی چاہی تھی، اس پر از ہر کے تمام علما اس کے دشمن بن گئے اور چونکہ شیخ از ہر کا اثر طلبہ پر منحصر نہیں، بلکہ تمام ملک اس کو مذہبی پیشوا تسلیم کرتا ہے، اس لیے پاشاے موصوف کو اغماض کرنا پڑا۔ از ہر حقیقت میں ایک ملکی طاقت ہے اور خود سلطنت اس کی مخالفت پر بہ آسانی جرأت نہیں کر سکتی۔[۱۲۲]

مصر والوں کو حقیقت میں اس بات پر ناز کرنا چاہیے کہ مولد [نبیؐ] کے اصل معنی اگر سمجھے تو انھی نے سمجھے۔ یہاں مولد کا طریقہ یہ ہے کہ شہر سے باہر ایک وسیع خطہ زمین ہے، جس کو ایک معزز خاتون نے اسی کام کے واسطے وقف کر دیا ہے۔ اس میدان میں تین طرف نہایت ترتیب اور سلیقے سے خیمے اور شامیانے نصب ہوتے ہیں اور بیچ کی زمین بطور صحن

۱۲۱: ایضاً، ۱۶۷ ۱۲۲: ایضاً، ۱۶۸

کے چھوڑ دی جاتی ہے۔ صحن بالکل دائرے کی ہیئت میں ہوتا ہے اور اس کے ہر چہار طرف سرخ جھنڈیاں کھڑی کی جاتی ہیں۔ خیمے اور شامیانے چونکہ عموماً پاشاؤں اور امرا کے ہوتے ہیں، نہایت تکلف اور نفاست سے آراستہ کیے جاتے ہیں۔ ہر پاشا اور امیر اپنا خیمہ جداگانہ طرز سے آراستہ کرتا ہے، جھاڑ و فانوس کی روشنی ہوتی ہے اور کثرت سے ہوتی ہے، ہر خیمہ میں شربت یا چائے یا اَور کوئی اس قسم کی چیز ہر وقت مہیا رہتی ہے۔ جس وقت کوئی شخص، اگرچہ وہ عام تماشائی ہو، خیمہ میں داخل ہوتا ہے، فوراً چائے یا شربت سے اس کی تواضع کی جاتی ہے[۱۲۳]۔ [ربیع الاوّل کی] پہلی تاریخ سے یہ اجتماع شروع ہوتا ہے اور روز بروز بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ بارھویں کی شب کو اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ کشاکش سے جگہ نہیں ملتی۔ صبح کو سب لوگ، خصوصاً نائب الحکومت، قاضی، مفتی، شیخ الازہر، مشہد حسین میں جمع ہوتے ہیں اور ایک عالم آنحضرتؐ کی ولادت کے حالات پڑھتا ہے۔ ولادت کے ذکر کے وقت معمول کے موافق قیام ہوتا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد مجلس ختم ہو جاتی ہے، جس کے ساتھ مولد کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ مولد کا یہ طریقہ اس لحاظ سے مجھ کو بہت پسند آیا کہ آنحضرتؐ کی ولادت پر جس جوش اور مسرت کا اظہار ہونا چاہیے، وہ اسی طریقے سے ہونا چاہیے۔ چھوٹی چھوٹی مجلسوں میں یہ اجتماع، شان و شوکت، سرو ساماں کہاں![۱۲۴]

قسطنطنیہ کی طرح یہاں بھی علما اور مصنفین کے دو گروہ ہیں اور دونوں کا مذاق بالکل الگ الگ ہے۔ ازہر کے شیوخ اور تلامذہ میں سے بعض بعض اپنے فن، یعنی نحو و فقہ میں کامل خیال کیے جاتے ہیں، لیکن اُن کے کمال کا تمام تر مدار صرف جزئیات کے حفظ پر ہے، جس میں تحقیق و اجتہاد کا شائبہ نہیں۔ خود شیخ ازہر، جن کو امام الفن کہا جاتا ہے، کسی فن میں ان کی کوئی ممتاز تصنیف نہیں۔ نئی تعلیم نے بھی اگرچہ اب تک کوئی بڑا صاحبِ کمال نہیں پیدا کیا، لیکن اُس میں تحقیق و اجتہاد کی جھلک پائی جاتی ہے اور تصنیفات میں یورپ کا انداز ہے۔[۱۲۵]

۱۲۳: ایضاً، ۱۸۳
۱۲۴: ایضاً، ۱۸۴-۱۸۵
۱۲۵: ایضاً، ۱۸۵

شیخ محمد عبدہٗ پرانے تعلیم یافتہ ہیں۔فن وادب میں تمام مصروشام ان کواستادالفن تسلیم کرتا ہے۔روشن ضمیری کے ساتھ نئے مذاق سے آشنا ہیں، جس کا سبب سید جمال الدین افغانی کا فیضِ صحبت ہے۔میں اُن سے ملا تھا، دیر تک لطف کی صحبت رہی۔ازہر کی ابتریِ تعلیم پر افسوس کرتے تھے، لیکن اس کے ساتھ نئی تعلیم کے بھی سخت شاکی تھے اور کہتے تھے کہ هٰؤُلَاءِ اَضَلُّ سَبِیْلًا۔[۱۲۶]

شیخ حمزہ فتح اللہ پرانے تعلیم یافتہ اور پرانے خیالات کے آدمی ہیں۔فنِ ادب کے بڑے استاد ہیں۔دارالعلوم میں ادب کا جو نصاب پڑھایا جاتا ہے، انھی کا انتخاب ہے۔ سررشتہ تعلیم کے انسپکٹر ہیں۔سویڈن کی اورینٹل کانفرنس میں عورتوں کے حقوق کے متعلق ایک رسالہ [حقوق النساء فی الاسلام] پیش کیا تھا۔ان سے نظارۃ المعارف کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔دیر تک علمی تذکرے رہے۔رسالہ مذکورہ کی پانچ جلدیں تحفہ کے طور پر عنایت کیں۔کچہری سے اُٹھ کر اپنے مکان پر لے گئے اور اصرار کر کے کھانا کھلایا؛ نہایت سادہ، یعنی خشک روٹی اور کھجوریں تھیں۔چونکہ وہ عربی زبان کے استاد ہیں اور عرب کے ساتھ اُن کو خاص محبت اور لگاؤ ہے، ان کا سادہ عربی کھانا ایک اثر پیدا کرتا ہے۔میں اور شیخ کھانا کھا رہے تھے کہ قریب سے ہیچوں ہیچوں کی آواز آئی۔میں حیران تھا کہ یہ انکرالاصوات کہاں سے آتی ہے۔دیکھا تو ایک حجرے میں گدھا بندھا ہے۔معلوم ہوا کہ یہاں گھر میں گدھا باندھنا معیوب نہیں۔اگرچہ میں بازار میں اکثر لوگوں کو، حتیٰ کہ انگریزوں کو گدھے پر سوار پھرتے دیکھ چکا تھا، بلکہ خود بھی دو ایک بار یہ شرف حاصل کر چکا تھا، تاہم مجھ کو یہ توقع نہ تھی کہ بھلے آدمیوں کے ہاں گھوڑوں کی طرح گدھوں کا بھی اصطبل خانہ ہوتا ہے۔[۱۲۷]

جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا، وہ اسی قدیم تعلیم کی اَبتری تھی۔یہ مسئلہ آج کل ہندوستان میں بھی چھڑا ہوا ہے اور تعلیمِ قدیم کی اَبتری پر عموماً رنج اور افسوس کیا جاتا ہے، لیکن میرا افسوس دوسری قسم کا افسوس ہے۔ہمارے ملک کے نئے

۱۲۶: ایضاً، ۱۸۷-۱۸۸ ۱۲۷: ایضاً، ۱۸۹

تعلیم یافتہ پرانی تعلیم پر جو رنج اور افسوس ظاہر کرتے ہیں، وہ درحقیقت رنج نہیں، بلکہ استہزا اور شماتت ہے۔ مَیں اگرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں، تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومیت قائم رہنے کے لیے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ تعلیم جس طریقے سے جاری ہے، وہ بالکل بے سُود اور بے معنی ہے تو خواہ مخواہ نہایت رنج ہوتا ہے۔ ہندوستان میں تو اس خیال سے صبر آجاتا تھا کہ جو چیز گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں نہ ہو، اس کی بے سروسامانی قدرتی بات ہے، لیکن قسطنطنیہ، شام، مصر میں یہ حالت دیکھ کر سخت رنج ہوتا تھا۔[۱۲۸] تعلیم قدیم کے متعلق سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ تعلیم کا اسٹینڈرڈ نہایت چھوٹا رکھا گیا ہے۔ علمِ ادب کا پتا نہیں، منطق و فلسفہ میں ایسا غوجی اور شمسیہ انتہائی کتابیں ہیں، صحاح ستہ شاید ہی کسی مدرسے میں پڑھائی جاتی ہو۔ معانی و بلاغت واصولِ فقہ کا بھی یہی حال ہے، فقہ پر البتہ بہت کچھ توجہ ہے، لیکن اس کی تعلیم بھی مجتہدانہ نہیں، بلکہ نہایت عامیانہ اور مقلدانہ ہے۔ بعض بعض مولویوں سے میری ملاقات تھی، وہ ایسے جزئی اور عام مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے کہ مجھ کو تعجب اور افسوس ہوتا تھا۔[۱۲۹]

....

مصر کی روانگی کے ساتھ گویا میرے سفر کا بھی خاتمہ ہو گیا، کیونکہ اس کے بعد نہ کوئی نئی آبادی دیکھی، نہ کوئی جدید واقعہ پیش آیا۔ مَیں نے سفر کا تمام زمانہ خلافِ توقع نہایت لطف، آرام، دلچسپی اور اطمینان کے ساتھ بسر کیا، لیکن اس موقعے پر یہ بتانا میرا فرض ہے کہ یہ لطف و آرام مجھ کو کیوں نصیب ہوا اور کن لوگوں کی وجہ سے ہوا؟ ان سوالوں کا صرف ایک جواب ہے، یعنی عربوں اور ترکوں کے فیاضانہ اخلاق۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر عربوں کی کریم الاخلاقی سے مجھ کو سابقہ نہ پڑتا تو سفر کی دلچسپیوں کا کیا ذکر ہے، زندگی دوبھر ہو جاتی۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی شہر میں جا کر رہنا، کھانا پینا، ملنا جلنا، خرید فروخت، سیر و تماشا، حالات کی تحقیق و جستجو،

۱۲۸: ایضاً، ۶۶ ۱۲۹: ایضاً، ۶۷-۶۸

دریافت طلب امور کی تلاش؛ غرض تمام باتیں زبان کے جاننے پر موقوف ہیں اور مَیں ترکی زبان سے بالکل ناواقف؛ عربی زبان جس قدر جانتا تھا، وہ بھی بیکار یا قریب قریب بیکار تھی۔ اس قدر دولت مند بھی نہ تھا کہ بے دریغ روپیوں کے صَرف سے اس کمی کا تدارک کرسکتا۔ ایسی حالت میں چھ مہینے کا زمانہ اس لطف و آرام سے بسر کرنا کہ گویا مَیں وطن ہی میں تھا، صرف ترکوں اور خاص کر عربوں کی عنایت تھی۔ ترجمانی یہ کرتے تھے، بازار سے چیزیں لا دیا کرتے تھے، لوگوں سے تعارف یہ کراتے تھے، قابلِ سیر مقامات میں رہبر یہ بنتے تھے، دل لگی کی صحبتوں میں شریک یہ ہوتے تھے؛ غرض کوئی ایسا کام اور ایسی ضرورت نہ تھی، جس کے یہ کفیل نہ تھے اور لطف یہ کہ بے غرض، بے سبب، صرف مہمان پرستی اور غریب نوازی کے لحاظ سے۔[۱۳۰]

....

جب مَیں [۲۶ رمحرم ۱۳۱۰ء کو] ترکی سے [ہندوستان] واپس آیا تھا تو اتفاق سے گھر میں علالت تھی۔ ایک رات کو بارہ بجے تار آیا۔ مَیں نے اس کو کھولا، دل میں دُبدھا پیدا ہوا کہ کیا واقعہ ہے؛ خدا جانے، کیسا تار ہے۔ خیر، مَیں دوڑا ہوا سرسید کے نواسے کے پاس گیا۔ انھوں نے پڑھ سنایا کہ یہ تار نواب علی حسن خاں صاحب نے بھوپال سے بھیجا ہے۔ وہ آپ کو ترکی سے بخیریت واپس آنے پر مبارک باد دیتے ہیں۔ یہ جال ہم مولویوں کا ہے![۱۳۱]

....

[کالج اسٹاف کی جانب سے ڈنر...... ۶ ردسمبر ۱۸۹۲ء]

قاصدِ خوش خبر امروز نوا ساز آمد
کز سفر یارِ سفر کردۂ ما باز آمد
از سفر شبلیِ آزادہ بہ کالج برسید
یا مگر بلبلِ شیراز بہ شیراز آمد

۱۳۰: ایضاً، ۱۸۹
۱۳۱: شبلی بحوالہ حیات، ۱۳۳

دوستاں مژدہ کہ آں بلبلِ خوش لہجہ دگر
اندریں تازہ چمن زمزمہ پرداز آمد

رفت ہرچند بسے بے سر و ساماں امّا
شکرِ ایزد کہ بایں برگ و بایں ساز آمد[۱۳۲]

....

الغزالی کے لکھنے کا ارادہ بہت مذبذب ہے۔ تین خیالی تصنیفیں سامنے ہیں: قرآن کا اعجاز، فارسی یا عربی شاعری کی ہسٹری، الغزالی۔ ان میں اب تک فیصلہ نہیں ہوتا۔ جس دن فیصلہ ہو جائے گا، لکھنا شروع کر دوں گا۔[۱۳۳] سفرنامے کے لیے عام اصرار ہے اور تمام اطراف سے مانگ آنی شروع ہوگئی ہے، لیکن میرا ارادہ ابھی تک لکھنے کا نہیں ہے۔ اس سفر [روم ومصر وشام] کے حالات اس قدر ہیں کہ اگر مَیں وہاں [اعظم گڑھ میں] ہوتا تو مہینوں کی گرمیِ مجلس کے لیے سامان ہو سکتا تھا؛ لیکن مجبوری ہے، اعظم گڑھ میری قسمت میں نہیں ہے اور اب مجھ کو وہ لگاؤ بھی نہیں رہا۔[۱۳۴]

دسمبر میں کانفرنس دہلی میں میرا خود قصد شرکت کا نہیں ہے۔ کانفرنس اب کی پھیکی ہو گی۔ مولوی حشمت اللہ ومرزا حیرت کی بڑ بہت سن چکے، مولوی حالی صاحب کا کوئی پارٹ نہیں ہے، مولوی نذیر احمد بھی غالباً چپ رہیں اور بولیں بھی تو ان کا طرز اجیرن ہو چکا۔[۱۳۵]

....

میاں مہدی کی علالت کا سن کر افسوس ہوا، خدا ان کو صحت دے۔[۱۳۶]

....

میرا ایک مدت سے خیال ہے کہ بڑی بڑی سوانح عمریاں تو مدتوں میں لکھی جا سکتی ہیں، لیکن نامورانِ سلف کے مختصر حالات بھی اگر چھوٹے چھوٹے رسالوں کی شکل میں شائع ہوں تو نہایت مفید ہے۔ مَیں نے ترکی میں اس قسم کا ایک سلسلۂ تصنیف دیکھا، جس کا نام

۱۳۲: کلیاتِ فارسی، ۲۶ ۱۳۳: بنام سید ممتاز علی، ۱۸۹۲/۱۰/۲۱ء، مکتوبات، ۱۷۱

۱۳۴: بنام محمد اسحاق، ۱۸۹۲/۱۰/۲۴ء، اوّل، ۳۰ ۱۳۵: ایضاً

۱۳۶: ایضاً

مشاہیرِ رجال ہے۔ اس میں نظام الملک، فخر رازی، مولوی روم اور بہت سے بزرگوں کے حالات میں مستقل رسالے ہیں اور ان سب کو یکجا کر کے ایک مجموعہ چھاپا گیا ہے۔ اس کو دیکھ کر مجھ کو خیال ہوا کہ ہمارے ملک میں بھی اس قسم کا ایک سلسلہ قائم ہونا چاہیے، یعنی قوم کے چند اعیان چند بزرگوں کے حالات لکھیں اور ان سب کو ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب کر کے شائع کیا جائے، چنانچہ مَیں نے بعض دوستوں سے اس کے متعلق خط کتابت بھی کی اور کر رہا ہوں۔[۱۳۷]

---

۱۳۷ بنام شرف الدین، ۲۹/۱۲/۱۸۹۲ء، اوّل، ۳۲۷